یادنامہ۔ ڈاکٹر وزیر آغا
انور سدید

یادنامہ۔ ڈاکٹر وزیر آغا

انور سدید

جمہوری پبلیکیشنز

انتساب

ماہنامہ ''کامران'' سرگودھا کے مدیر

انور گوئندی

کے نام

''اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں''

Independent & Progressive Books

• نام کتاب۔یادنامہ۔ڈاکٹر وزیر آغا • مصنف۔انور سدید
• اشاعت۔2015ء • سرورق۔مصباح سرفراز
• ناشر۔جمہوری پبلیکیشنز لاہور • جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-652-024-5

قیمت 280 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرون پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Yadnama- Dr. Wazir Agha

Find us on

Jumhoori Publications

2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan
T: +92-42-36314140 F: +92-42-36283098
info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

عرضِ سدید

ڈاکٹر وزیر آغا جو ملک کے ممتاز ادیب، نامور شاعر، بے مثل انشائیہ نگار اور عہد ساز رسالہ ''اوراق'' کے مدیر تھے، ۷ ستمبر ۲۰۱۰ کو اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ اپنا رزق حیات دھرتی کی کاشتکاری سے حاصل کرتے تھے لیکن ادب ان کی روحانی پناہ گاہ تھا۔ وہ زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہر وقت سوچ میں مستغرق رہنے والے ادیب تھے۔ اور مفکر بھی تھے اور مدیر بھی نقاد بھی تھے اور نظریہ ساز بھی۔ انہوں نے اپنی شاعری، انشائیہ اور تنقید سے اردو ادب کے آفاق کو منوّر کیا اور رسالہ ''ادبی دنیا'' اور ''اوراق'' کے وسیلے سے بے شمار نئے لکھنے والوں کو ان کے اظہار کی صنف کے مطابق ارتقاء کا اگلا قدم اُٹھانے میں معاونت کی۔ اس وقت آسمانِ ادب پر جتنی روشنی نظر آتی ہے وہ ان قلم کاروں کی پھیلائی ہوئی روشنی ہے جن کی تخلیقات رسالہ ''ادبی دنیا'' اور ''اوراق'' میں چھپتی تھیں تو پوری اُردو دنیا ان کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ وزیر آغا نے اپنی زندگی کے آخری ایامِ تک قلم و قرطاس کے ساتھ رشتہ قائم رکھا اور ان کی دو کتابیں جن کی ترتیب و تدوین انہوں نے اپنے ایامِ حیات میں کی تھی، ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں، ان میں سے ایک ان کا آخری شعری مجموعہ ''کاسہ شام'' ہے اور دوسری نثر کی کتاب ''تنقیدی تھیوری کے سو سال'' ہے۔ ان کی سابقہ کتابوں کے نئے ایڈیشن بڑے خوبصورت اور دل آویز انداز میں پیش کیے جا رہے ہیں اور اہل ادب یہ باور کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وزیر آغا وجودی طور پر ہم سے جدا ہو گئے ہیں لیکن روحانی طور پر زندہ ہیں اور ان کی تصنیفات سے دانش کی خوشبو اٹھ رہی ہے، یہ روشنی ہر طرف پھیل رہی ہے اور ہم اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے میرا پہلا تعارف ادبی رسائل میں ان کے مضامین سے ہوا تھا۔ پھر سرگودھا

کا باسی ہونے کے ناتے ان سے جو تعلق پیدا ہوا وہ محبت کے دائمی رشتے میں تبدیل ہو گیا اور ان کی زندگی کے آخری ایام تک قائم رہا۔ میں نے اس ربط و تعلق کی پوری داستان اپنے مضامین میں پیش کی ہے اور ایک دفعہ پھر تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے ادب میں متعارف کرانے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا کردار بے حد اہم ہے۔ میرے لیے وہ راستہ دکھانے والا روشنی کا ستارہ تھے۔ وہ میرے محسنِ ادب تھے۔ ان کی وفات میرا ذاتی صدمہ ہے جس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ادب کے رشتے خون کے رشتوں پر فوقیت رکھتے ہیں اور اب میں اکلاپے یا تنہائی کا شکار ہوں تو میرا ہر لمحہ ان کی یاد میں گزرتا ہے۔ میں نے آغا صاحب کی زندگی میں ان کے فن پر دو کتابیں ''وزیر آغا ایک مطالعہ'' اور ''شام کا سورج'' کے عنوان سے پیش کی تھیں۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو انہوں نے میرے نام لکھے تھے۔

ان کی وفات کے بعد میں نے ان پر جو مضامین لکھے، ان میں مفارقت کا احساس اور احسان مندی کا جذبہ شاید نمایاں نظر آئے۔ میں نے گذشتہ چند برسوں کے دوران مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین اس کتاب میں پیش کر دیے ہیں۔ جذبات کی شدت اور حدت کو قائم رکھنے کے لیے ان مضامین میں تبدیلی نہیں کی گئی اور تکرار ناگزیر ہو گئی ہے۔ میں جناب فرخ سہیل گوئندی کا شکرگزار ہوں کہ وہ اس ''یادنامے'' کو اپنے جلیل القدر اشاعتی ادارے سے منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔

انور سدید

22 جون 2015

172۔ ستلج بلاک

علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور۔ (پاکستان)

فون (0334-9719278)

فہرست

Scanned with CamScanner

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
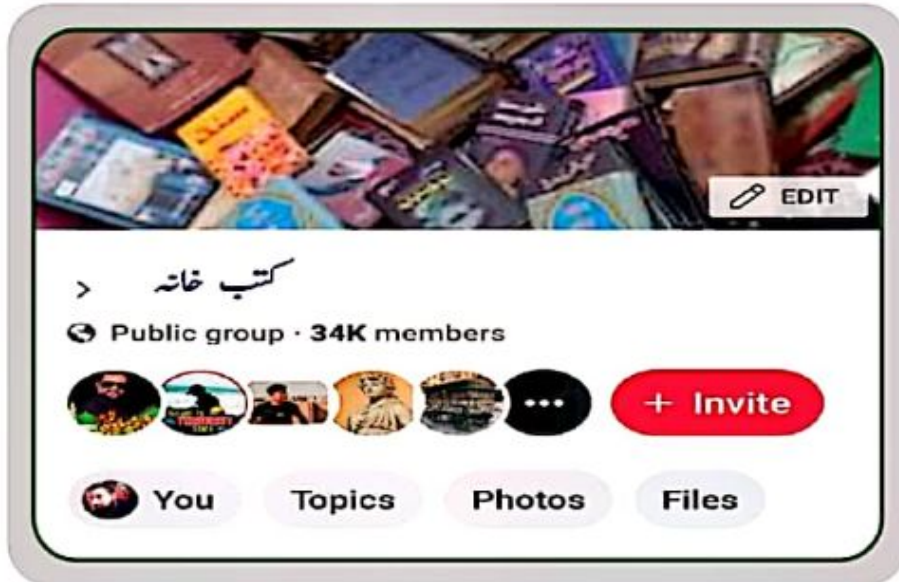
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلی ملاقات

اب یاد کرتا ہوں تو ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلی ملاقات جولائی 1961ء کی گرم دوپہر کو سرگودھا میں ہوئی تھی۔ اس پہلی ملاقات میں میرے راہنما سجاد نقوی تھے۔ میں اپنے ملازمتی مرکز، بیدیاں (ضلع لاہور) سے چار دن کی چھٹی پر سرگودھا میں ایک شادی کی تقریب میں آیا تھا اور اپنے معمول کے مطابق ''کامران'' کے مدیر جناب انور گوئندی سے ملنے کے لیے ان کے دفتر میں گیا تھا۔ گوئندی صاحب نے دفتر میں موجود ایک دبلے پتلے نستعلیق سے شخص کی طرف اشارہ کر کے پوچھا:

''سجاد نقوی صاحب سے ملیے...... یہ ''کامران'' کی ترتیب و تدوین میں میری معاونت کرتے ہیں اور خود بھی افسانہ نگار ہیں۔''

تعارف کرانے کے بعد انہوں نے نقوی صاحب سے پوچھا'' آج وزیر آغا صاحب نے شہر آنا تھا۔ ان کی آمد کی کوئی خبر ملی ہے؟'' نقوی صاحب اس وقت رسالہ ''کامران'' کے لیے کتابوں پر تبصرے لکھ رہے تھے۔ سامنے شمس آغا کے افسانوں کی کتاب ''اندھیرے کے جگنو'' پڑی تھی۔ نقوی صاحب سے مصافحہ کر کے خالی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ انور گوئندی صاحب نے سوال کا رخ میری طرف کر دیا۔

''آپ وزیر آغا سے کبھی ملے ہیں؟''

میں ان دنوں وارسک ڈیم پشاور سے تبدیل ہو کر لاہور کے قریب بی آر بی ڈی نہر پر بطور سب انجینئر متعین تھا اور ایس ڈی او کے عہدے پر ترقی پانے والا تھا۔ اس نہر کی پہلی آب روانی ہونے والی تھی۔ بھارت نے نہری پانی بند کرنے کی دھمکی دے رکھی تھی۔ بی آر بی ڈی کی صورت یہ تھی کہ تکمیل

کے بعد عرصے تک اس میں پانی نہیں چلایا گیا تھا حالاں کہ متبادل انتظامات کے تحت مرالہ ہیڈ ورکس سے نکلنے والی بڑی نہر سے ایک اور شاخ بمباں والہ سے تعمیر کی گئی تھی جو دریائے راوی کے تل کے نیچے سے ایک بڑے سائیفن کی صورت میں مغربی کنارے سے مشرقی کنارے تک پہنچتی اور پھر قصور کے نزدیک گنڈا سنگھ والا ہیڈ ورکس پر دیپالپور نہر کو پانی سپلائی کرتی تھی۔ دیر تک نہ چلائے جانے کی وجہ سے بی آر بی ڈی نہر جگہ جگہ سے شکستہ ہو گئی تھی۔ خارپشتوں نے اس کے مٹی کے کناروں میں اپنے مستقل ٹھکانے بنا لیے تھے۔ قصور کے نزدیک روہی نالے کا سائیفن سیلاب کی نذر ہو چکا تھا اور اس کی تعمیر نو ضروری تھی۔ برکی سے لے کر گنڈا سنگھ والا تک اس نہر کی مرمت کا کام مجھے تفویض کیا گیا تھا، اس لیے سرگودھا جانے کا اتفاق کم کم ہوتا تھا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں وزیر آغا کے نام اور ان کے کام سے آشنا نہیں تھا۔ سماجی لحاظ سے وہ ہمارے شہر کی ایک ممتاز ترین شخصیت آغا وسعت علی خان کے فرزند تھے۔ سرگودھا کے ریلوے سٹیشن کے پاس ان کی ایک وسیع و عریض حویلی تھی جس کے بڑے دروازے سے ہاتھی بھی اندر جا سکتا تھا۔ بڑے آغا صاحب اپنے گاؤں چک 56 جنوبی (جو وزیر کوٹ موسوم ہوتا تھا) سے شہر آتے تو لوگ ان کے کروفر اور جلال و جمال سے بہت متاثر ہوتے۔ جمال ان کی خوبصورت زرق برق رئیسی بگھی سے ظاہر ہوتا جس کے آگے ایک صحت مند آراستہ پیراستہ گھوڑا جتا ہوتا۔ آغا وسعت علی خان بالعموم ''برجس'' میں ہوتے اور ان کی سیاہ لمبی مونچھیں بڑی رعب دار جلالی محسوس ہوتیں۔ میں نے اس قسم کی بگھی سرگودھا کے امراء میں سے کسی کے پاس نہیں دیکھی۔ بڑے آغا صاحب کا نام تو شاید لوگوں کو معلوم نہیں تھا لیکن سب انہیں ''بگھی والے خان بہادر'' کہہ کر یاد کرتے تھے۔ اس بگھی کا انجر پنجر میں نے ایک لمبے عرصے تک آغا صاحب کی حویلی کے باہر پڑا ہوا دیکھا تھا۔

میرے لیے وزیر آغا کا تعارف دوسری نوعیت کا تھا۔ میں نے ان کے ادبی مضامین، انشائیے اور نظمیں مولانا صلاح الدین احمد کے رسالہ ''ادبی دنیا'' میں پڑھی تھیں۔ مسرت کے موضوع پر ان کے فلسفیانہ نوعیت کے مضامین اس رسالے میں چھپتے تو ان کا مطالعہ گہری دلچسپی سے کرتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد ''ادبی دنیا'' میں مضامین کا تعارف اس خوبصورت انداز میں کراتے تھے کہ مضامین کا داخل لو دینے لگتا اور قاری ان مضامین کی طرف سب سے پہلے راغب ہوتا۔ انور گوئندی نے پوچھا تو میں نے جواب دیا:

''مجھے آغا صاحب سے ملنے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن میں ان کے بہت سے مضامین پڑھ چکا ہوں۔'' اب انور گوئندی نے سجاد نقوی کی طرف اور سجاد نقوی نے انور گوئندی کی طرف حیرت سے دیکھا۔ حیرت کی اس دھند میں انور گوئندی نے کہا:

''شاہ جی! انور سدید سرگودھا میں لمبے وقفوں سے آتا ہے۔ وزیر آغا صاحب سے ان کی ملاقات آج ہی ہونی چاہئے''...... یہ کہہ کر اس نے اپنے ساختہ سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اس کے کڑوے کسیلے دھوئیں کو دیر تک باہر آنے کی اجازت نہ دی۔ اس ایک کش میں ہی انور گوئندی نے آدھا سگریٹ پھونک ڈالا تھا اور اب اس کی پھننگ پر لٹکے ہوئے گل کو اپنی خمار یں آنکھوں سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عاشق صادق وصال کے بعد اپنے محبوب کو دیکھتا ہے۔ سجاد نقوی نے پوچھا: ''گوئندی صاحب! کیا آپ بھی چلیں گے؟'' اس وقت ایک مدقوق سالڑکا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ایک چھوٹی سی پڑیا انور گوئندی کو پکڑا دی اور یک دوتی لے کر تیزی سے واپس چلا گیا۔ اس پڑیا کے ملتے ہی انور گوئندی کی نشہ آور آنکھوں میں انوکھی چمک سی پیدا ہوگئی۔ انور گوئندی نے میز کی دراز سے ''لیمپ'' کا سگریٹ نکالا۔ تمبا کو ہتھیلی پر ڈالا اور پڑیا کا بند قبا کھولنے لگا۔ سجاد نقوی نے ''کامران'' کے تبصروں کے کاغذ سمیٹے اور بولے: ''آپ انہیں لے کر چلیں۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔ اس وقت محمد حسن شوق آنے والے ہیں۔ لڑکا ان کی آمد کی اطلاع دے گیا ہے''۔

'' آیئے انور سدید صاحب، قبل اس کے کہ انور گوئندی کے سگریٹ کا کڑوا کسیلا دھواں ہمارے پھیپھڑوں میں داخل ہو، ہم نکل چلیں۔'' نیچے انور ریستوران پر سجاد نقوی کی سائیکل پڑی تھی۔ یہ وہی سائیکل تھی جس پر نقوی صاحب گھر سے کالج اور کالج سے دفتر کامران تک سفر کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ سائیکل تانگے سے ٹکرا گئی تو نقوی صاحب کا کولہا اتر گیا۔ یہ خستہ حال سائیکل دیکھ کر مجھے افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کی سائیکل یاد آ گئی، جس کا عبرت ناک نقشہ ضمیر جعفری صاحب نے ان کے خاکے میں پیش کیا تھا۔ میں نے سائیکل کی حالت دیکھ کر کہا:

''نقوی صاحب! کیا یہ ہم دونوں کا بوجھ برداشت کر لے گی۔ کہیں حشر کے دن بے رحمی کے جرم میں ہم دونوں کو دامن نہ پکڑ لے؟''

نقوی صاحب بولے: ''یہ ریلے کی اصلی مضبوط سائیکل ہے۔ میں نے ٹائر ٹیوب نئے ڈالے

ہیں۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں اور یہ بتائیں آپ آگے بیٹھیں گے آرام دہ ڈنڈے پر یا پیچھے کیریئر پر؟"

سجاد نقوی انکساری کی رو میں تھے۔ وہ سنگل پسلی کے جوان تھے۔ میرا جسم محکمہ آبپاشی میں دودھ، مکھن اور اپنی پولٹری کے مرغے کھا کھا کر فربہ ہو گیا تھا، نقوی صاحب کا وزن سو پاؤنڈ تھا تو میرا یقیناً اڑھائی سو پاؤنڈ ہوگا۔ میں نے کہا: "نقوی صاحب! آپ کا سائیکل میں چلاؤں گا۔ آپ "کامران" کے مدیر ہیں اور میں آپ کا معمولی سا قلم کار۔ سائیکل چلانا اور مدیر کو کھینچنا میرا فرض بنتا ہے۔ محکمہ نہر میں مجھے سائیکل چلانے کی بڑی پریکٹس ہو گئی ہے۔"

نقوی صاحب نے ایک معنی خیز جانچ بوجھتی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر کہا "اچھا تو یوں کرتے ہیں کہ آدھے فاصلے میں سائیکل میں چلاؤں گا۔ آدھا فاصلہ آپ چلائیں۔ نصف اوّل میرے ذمے!"

یہ کہہ کر وہ سائیکل پر سوار ہو گئے۔ مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ میں نے کہا: "جہاں نصف فاصلہ ختم ہو جائے مجھے بتا دیجئے گا۔" نقوی صاحب کے دھان پان جسم میں بلا کر پھرتی تھی۔ سائیکل پر بیٹھتے ہی پہیئے تیزی سے گھومنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرگودھا کی سڑکوں پر تانگے بھی اکا دکا ہی نظر آتے تھے۔ پیدل چلنے والوں کی بھیڑ بھی نہیں تھی۔ کمپنی باغ سے آگے شہر ختم ہو جاتا تھا۔ ریلوے لائن عبور کرتے ہی سول لائن میں داخل ہو جاتے تھے لیکن آغا صاحب کی حویلی ایک دور افتادہ ویران اور خاموش سے مقام پر تھی۔ بعد میں یہ حویلی اسی مقام پر ایک خوش نما "کوٹھی" میں تبدیل ہو گئی لیکن شہر کی حدیں پھیلنے لگیں۔ آغا صاحب کے بنگلے کے سامنے ایک سینما بن گیا اور اس کی تعمیر کے بعد آغا صاحب کا گھر شہر کے وسط میں آ گیا۔

ایک مقام پر پہنچ کر نقوی صاحب نے سائیکل کو بریک لگائی۔ اپنے قدم زمین پر جمائے تو میں نے باقی نصف حصے کا سفر طے کرنے کے لیے سائیکل چلانے اور اپنی باری بھگتانے کی تیاری کر لی لیکن نقوی صاحب نے یہ کہہ کر حیرت زدہ کر دیا کہ "ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں"۔ سامنے ایک حویلی تھی۔ بالکل قلعہ نما..... اس حویلی کے بڑے چوبی دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو ایک ملازم نے بتایا کہ "وزیر آغا صاحب بائیں طرف کے کمرے میں ہیں"۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ آغا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ان کے گرد بہت سی کتابیں پڑی تھیں۔ پاس ہی ان کی معروف فیلٹ پڑی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ کمرہ طویل اور عریض تھا۔ لیکن بالکل ویران سا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوا کہ کمرے کی سب سے قیمتی چیز وزیر آغا ہیں۔

نقوی صاحب سے ہاتھ ملا کر بولے:

''میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔''

میں نے وزیر آغا کے سراپا میں بڑے آغا صاحب کا جلال تلاش کرنا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وہ مجھے بے حد دھیمے مزاج کے انسان اور سمندر کی طرح شانت نظر آئے۔ سجاد نقوی نے میرا تعارف کروایا۔ ''یہ انور سدید ہیں، محکمہ نہر میں سب انجینئر ہیں۔ ''ماہ نو''، ''ہمایوں'' اور ''نیرنگ خیال'' میں افسانے لکھتے رہے ہیں۔ لیکن آج کل صرف نوکری کر رہے ہیں۔ ''ادبی دنیا'' باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ آپ کے مضامین اور نظمیں بھی انہوں نے پڑھ رکھی ہیں۔''

وزیر آغا بولے: ''میں نے ان کے افسانے ''کامران'' میں پڑھے ہیں۔ سال نامہ ''کامران'' میں انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب ''نقدِ میر'' پر جو تبصرہ لکھا تھا اسے سید صاحب نے بہت پسند کیا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کاغذات میں سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا خط نکالا اور مجھے پکڑاتے ہوئے پوچھا:

''انور سدید صاحب! آپ نے افسانہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟''

میں نے مؤدبانہ کہا: ''دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یا تو انجینئرنگ کا پیشہ مجھ پر غالب آ گیا ہے یا پھر افسانے نے مجھ سے منہ موڑ لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوسری وجہ درست ہے۔''

آغا صاحب سن کر بولے ''کبھی کبھی لکھنے والے پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب تخلیق کی دیوی فنکار کے حسب خواہش اس پر مہربان نہیں ہوتی۔ اس وقت اپنے اظہار کی صنف تبدیل کر لینی چاہیئے۔'' پھر انہوں نے کہا کہ جب نظم مجھ پر وارد نہیں ہوتی تو میں کسی تنقیدی مضمون کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں یا انشائیہ لکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے شمس آغا کے افسانوں کا مجموعہ ''اندھیرے کے جگنو'' مجھے دیا اور کہا

''اس کتاب پر ایک تنقیدی مضمون لکھ دیجئے۔ نقوی صاحب اسے ''کامران'' میں چھاپیں گے۔''

شمس آغا اس وقت دنیا سے روپوش ہو چکا تھا۔ اس نے آٹھ دس افسانے لکھ کر ادبی دنیا میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ کرشن چندر جیسے بڑے افسانہ نگار نے بھی شمس آغا کی تعریف کی تھی۔ میں نے ''ادبی دنیا'' میں اس کے سب افسانے پڑھے تھے۔ وزیر آغا کے مضمون ''ٹوٹا ہوا تارا'' نے شمس آغا کے بارے میں ایک عجیب سی جذباتی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ اگر چہ سجاد نقوی اس کتاب پر ''کامران'' کے لیے

تبصرہ لکھ رہے تھے لیکن آغا صاحب نے بطور خاص مجھے بھی لکھنے کے لیے کہا۔ چنانچہ میں نے مضمون لکھنے کا وعدہ کرلیا۔ اب چائے کی ٹرالی آ چکی تھی۔ آغا صاحب چائے بنانے لگے۔ اتنے میں صدر دروازے سے غلام جیلانی اصغر آتے دکھائی دیے۔ شام ڈھلنے تک مسعود الرؤف ڈپٹی کمشنر سرگودھا، پروفیسر خورشید رضوی ، ایس پی فضل حق، فخر الدین بلّے اور ایم ڈی شاد بھی آ گئے۔ اور شامِ دوستاں آباد ہو گئی۔ لمحہ بے کراں وسعت اختیار کر رہا تھا۔ یہ پہلی ملاقات دنوں، مہینوں اور برسوں تک پھیلتی جا رہی تھی تا آنکہ وہ وقت آ گیا جب وزیر آغا صاحب سفید چادر میں لپٹے ہوئے خاموش تھے اور ہم انہیں لحد میں اُتار رہے تھے۔

''دِن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا''

لیکن یہ سفر ایک اور جہان کی طرف تھا۔

سلسلہ آشنائی کا اور غمِ محرومیِ جاوید کا

میرے لیے تو اکیسویں صدی کا آغاز بے حد المناک تھا۔ اس صدی کے طلوع کے ساتھ ہی ذاتی صدموں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے اردو کے معروف افسانہ نگار رحمٰن مذنب کو' جو میرے بہترین دوستوں میں سے تھے' کوہ ندا سے بلاوا آ گیا۔ پھر پاکستان کے منفرد دیہات نگار اور ''میرا گاؤں'' جیسے بلند پایہ ناول کے مصنف غلام الثقلین نقوی نے اپنا رختِ حیات سمیٹ لیا۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے سامنے میں نے زانوائے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا لیکن تنقیدی دبستان، نظم جدید اور انشائیہ کے مباحث میں ان سے بے دریغ استفادہ کیا تھا اور میں نے انہیں ہمیشہ ادبی رہنما کا درجہ دیا۔ 26 دسمبر 2002ء کو خبر آئی کہ ادب کا یہ ستارہ دور تک غبارِ نور چھوڑتا ہوا کہیں فضا میں گم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی سے تعلق اس زمانے میں پیدا ہوا جب وہ ''صحیفہ'' کے مدیر مقرر ہوئے تھے۔ لیکن میں ان سے غائبانہ استفادہ اس زمانے سے کر رہا تھا جب ان کے نفسیاتی مقالے ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' نے ادبی دنیا میں تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ میں ان کے اس احسان کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ انہوں نے میرا پی ایچ ڈی کا خاکہ جسے دو سابق صدورِ شعبہ' کالج کی الماریوں میں گم کر چکے تھے' اورینٹل کالج لاہور کی ذخیرۂ کاغذات سے بازیافت کرایا اور مجھے ''اُردو ادب کی تحریکیں'' کے موضوع پر تحقیق کا کام کرنے کی اجازت دلائی۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور میں مستقل طور پر آباد ہوا تو پھر ڈاکٹر وحید قریشی کی قربت اور ان سے استفادہ کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اور یہ سلسلہ 17 اکتوبر 2009ء تک جاری رہا جب انہوں نے طویل علالت کے بعد اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ فرخندہ لودھی کے ساتھ میرا نسبی رشتہ نہیں تھا۔ ان

کے ساتھ میرا رابط و تعلق رسالہ ''اوراق'' جنوری 1966ء میں افسانہ ''پارہ'' چھپنے پر قائم ہوا تو یہ تعلق خونی رشتوں پر فوقیت اختیار کر گیا۔ اور ان کے آخری افسانے ''شادکام'' تک قائم رہا جب وہ مجھے اقبال ٹاؤن کے ایک محلے میں آباد کر کے خود ایک دور افتادہ کشادہ بستی (واپڈا ٹاؤن) میں منتقل ہو گئیں اور وہیں اپنا آخری ناول ''جنڈ والا نگیار'' لکھ کر 5 مئی 2010ء کو ملک عدم کو روانہ ہو گئیں۔ ان میں سے ہر فرد...... فرد جلیل تھا۔ ان سب سے میرا ذاتی تعلق اتنا گہرا تھا کہ ہر ایک کی موت نے مجھے گہرے ذاتی صدمے سے دوچار کیا اور میں نے ہر صدمے کو مشیتِ ایزدی سمجھ کر صبر سے قبول کیا کہ ''موت سے کس کو رستگاری ہے۔'' لیکن 7 ستمبر 2010ء کو اس دنیا سے وہ ہستی اٹھ گئی جس نے ادب سے بھاگے ہوئے ایک شخص کو جس کا پیدائشی نام محمد انوار الدین تھا، اپنے ادبی فیض سے انور سدید بنا دیا تھا۔ یہ ہستی ڈاکٹر وزیر آغا کی تھی اور انور سدید...... محمد انوار الدین کا ہم زاد تھا۔ میں اپنے ہم زاد سے اکثر سوال کرتا۔

اگر تم 1964ء کے اوائل میں محکمہ آبپاشی پنجاب کے ''بیدیاں سب ڈویژن'' سے تبدیل ہو کر ''رانی واہ ڈرینج سب ڈویژن سرگودھا'' میں تعینات نہ ہوتے......

اگر تم انور گوندی مدیر ''کامران'' کے چوبارے پر، جس نے تمہیں انجینئرنگ کی مصروفیت کے باوجود ادب سے غیر حاضر نہیں ہونے دیا تھا اور رسالہ ''ہمایوں'' میں چھپے ہوئے تمہارے پرانے افسانے شائع کر کے تمہیں ادبی دنیا میں حاضر شمار کیا تھا، باقاعدگی سے نہ بیٹھتے اور ''اینٹی فنیٹی'' کے دھوئیں کو شدید نفرت کے باوجود برداشت نہ کرتے......

''اگر تم ہر شام وزیر آغا کی محفل میں گزارنے، ان کی باتیں سننے اور سنتے رہنے کی عادت کو اپنا روز مرہ کا معمول نہ بناتے۔ اور اس محفل میں شامل ہونے والے ادیبوں۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر خورشید رضوی، پرنسپل رحمان قریشی، پرویز بزمی، عبدالرشید اشک اور عصمت علیگ جیسے ادیبوں کی گفتگو میں شامل نہ ہوتے۔

تو کیا تم آج ادیبوں کی کسی صف میں کھڑے ہوتے؟

کیا پہلے ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کرتے؟

تیس چالیس کتابوں کے مؤلف اور مصنف بنتے؟

محکمہ آبپاشی سے دسمبر 1988ء میں ریٹائر ہونے کے بعد ادب اور صحافت کو اپنا اوڑھنا

بچھونا بناتے؟

ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' ہفت روزہ ''زندگی''، روزنامہ ''خبریں'' کی سیڑھیاں طے کرتے اور ''نوائے وقت'' جیسے ممتاز اور وقیع ترین اخبار میں ریٹائرمنٹ کے بعد ایڈیٹوریل کے شعبے میں جگہ پاتے؟

ان سب سوالات کے جواب میں میرے ہم زاد نے نفی میں سر ہلایا اور میں نے فیصلہ کن انداز میں تسلیم کیا کہ اگر ساٹھ کی دہائی میں سجاد نقوی میری ملاقات ڈاکٹر وزیر آغا سے نہ کراتے تو شاید مجھے ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہونے اور ان کے قریب آنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ انہوں نے اپنا رسالہ ''اوراق'' جاری کیا تو تو مجھے کثرت سے مطالعہ کر کے اس میں مضامین لکھنے کی تربیت دی، اگر وہ میرے مضامین کی اشاعت سے میری حوصلہ افزائی نہ کرتے تو میں ادب کا قاری تو ضرور بنا رہتا، لیکن شاید ادیب نہ بن سکتا (میرا ہم زاد تو میری اس حیثیت کو اب بھی مشکوک قرار دیتا ہے)۔

زمانی لحاظ سے وزیر آغا سے میں اس زمانے سے واقف تھا جب انہوں نے نصرت آرا نصرت کا فرضی نام ترک کر دیا تھا اور مولانا صلاح الدین احمد کے رسالہ ''ادبی دنیا'' میں ''مسرّت'' کے موضوع پر سلسلہ وار مضامین اور نظمیں لکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے انور گوئندی کے رسالہ ''کامران'' کی سرپرستی فرمانی شروع کی تو اس تعارف کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ میں ان دنوں کلورکوٹ (میانوالی) میں محکمہ نہر کی استر کاری پر مامور تھا۔ تعطیل پر سرگودھا آتا تو دفتر ''کامران'' میں حاضری ضرور دیتا، جہاں رشیوں کے رشی محمد حسین شوق۔ غلام جیلانی اصغر، مرزا محمد منور، جوہر نظامی، مقبول لائل پوری اور خنجر بریلوی جیسے شعرا سے ملنے کا موقع ملتا۔ انہی دنوں انور گوئندی نے ''کامران'' کا پہلا سال نامہ پیش کرنے کا منصوبہ بنایا تو وہ اس پیشکش کو منفرد بنانے کے لیے وزیر آغا سے مشورہ کرنے کے خواہاں ہوئے اور وزیر کوٹ جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ آغا صاحب نے اپنا تانگہ لاری اڈے پر بھیج دیا تھا، جو ہم کو نہر کے کنارے ڈلکی چال چلتا ہوا اور فطرت کے نظارے کراتا ہوا وزیر کوٹ لے گیا۔ اس مقامی سفر کی ایک بہترین یاد تو وزیر آغا صاحب سے ملاقات ہے لیکن اس کا ایک اور گراں قدر حاصل ان کے والد گرامی آغا وسعت علی خان (د، ع، خ) کی خدمت میں حاضری تھی جن کی باتیں اس دور میں ''اپدیش'' کا درجہ حاصل کر چکی تھیں۔ میں نے ان متصوفانہ باتوں کی بیاض ''رادھے شیام کے نام'' سے تالیف کی تھی۔ د، ع، خ کو میری اس جسارت کا علم ہوا تو کتاب

چھپ چکی تھی لیکن انہوں نے اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی۔ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد منظر عام پر لائی گئی اور پورے برصغیر میں پسند کی گئی تھی۔ جناب د، ع، خ نے اس میں ایک ویدانتی کو تصوف کے رموز سے آشنا کرنے کی کاوش فرمائی تھی۔

اس دور میں آغا صاحب کی اکلوتی بیٹی وقارالنساء جسے وہ پیار سے مینا کہتے تھے، سکول جانے کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ اس لیے وہ وزیرکوٹ سے سرگودھا منتقل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے پرانے سرائے نما مکان کو منہدم کر کے ایک خوبصورت دو منزلہ کشادہ بنگلہ تعمیر کرلیا تھا۔ اس بنگلے کا سب سے پیارا حصہ برآمدے کے آخر میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو ادبیات عالیہ اور علوم جدیدہ کی کتابوں سے مزین تھا۔ وزیر آغا کی نشست دن بھر یہیں رہتی تھی اور شام کے وقت ادیبوں کی محفل جمتی، ایک ٹرالی میں چائے آتی۔ اس زمانے میں آغا صاحب کی شام کی چائے کے ساتھ بنگالی رس گلے پیش کیے جاتے تھے اور یہ ان کی چائے کی پہچان بن گئے تھے۔ ان کی لائبریری میں ایک خاص سحر تھا۔ میں الماریوں میں سجی ہوئی کتابوں کو حسرت سے دیکھتا لیکن مستعار لینے کی جراءت نہ کرسکتا۔ آغا صاحب ان دنوں '' اُردو شاعری کا مزاج '' لکھ رہے تھے۔ اس سے قبل ان کی تین کتابیں '' مسرت کی تلاش'' اور پی ایچ ڈی کا مقالہ '' اُردو ادب میں طنز و مزاح '' اور انشائیوں کی کتاب '' خیال پارے'' چھپ چکی تھیں اور پاک و ہند میں ان کی پذیرائی وسیع پیمانے پر ہوئی تھی، '' اُردو شاعری کا مزاج '' مختلف نوعیت کی کتاب تھی جس کے ابواب پر شام کو آغا صاحب کی محفل ادب میں بحث ہوتی تھی۔ ایک دن بحث کے دوران کسی حوالے کی کتاب کا ذکر آیا تو آغا صاحب نے پوچھا :'' آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟''

میں نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے انگریزی کی ایک کتاب مجھے دی اور کہا کہ '' تین چار دن میں اسے پڑھ لو اور پھر ''اردو شاعری کا مزاج'' کے اس باب پر بحث ہوگی جو تہذیبوں کے انضمام کے بارے میں ہے۔'' آغا صاحب سے کتابیں مستعار لینے کا یہ آغاز تھا جو بے حد سودمند ثابت ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد آہستہ آہستہ ان کی لائبریری میرے گھر منتقل ہونے لگی اور میرے مطالعے کو ہر روز ایک نئی مہمیز لگنے لگی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ آغا صاحب کو اپنی کسی کتاب کی ضرورت پڑتی تو اپنا آدمی بھیج کر کتاب منگوا لیتے، لیکن میرے اصرار کو بھی اہمیت دیتے تھے کہ ''استعمال کے بعد واپس کردیں۔''

اس زمانے کا ناگہانی واقعہ ''ادبی دنیا'' کے نامور ادیب مولانا صلاح الدین احمد کی وفات ہے۔ مولانا ضلع منٹگمری (حال ساہیوال) کے ایک قصبے قبولہ میں ''اردو کانفرنس'' میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ جلسہ گاہ کی طرف طفیل ہوشیار پوری کے ساتھ جا رہے تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑ گیا اور طبی امداد ملنے سے قبل وہ اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔ ان کی وفات پر جہاں جہاں اُردو بولی، پڑھی اور لکھی جاتی تھی ایک کہرام برپا ہو گیا۔ ان کی تدفین کے بعد یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اب ''ادبی دنیا'' جو مولانا صلاح الدین احمد کی رگِ جان تھا، کس طرح جاری رہ سکے گا؟ اکثر لوگوں نے مولانا کے سوئم کی تقریب قرآن خوانی میں ''ادبی دنیا'' کے شریک مدیر ڈاکٹر وزیر آغا کو یہ منصب سنبھالنے کی تجویز پیش کی کہ وہ اس عہد ساز رسالہ کی ادارت کے فرائض ادا کریں جس نے اردو ادب کو ڈاکٹر عاشق بٹالوی کرشن چندر، ممتاز مفتی راجندر سنگھ بیدی، جاوید جعفری، پریم ناتھ در، آغا بابر، شمس آغا اور بے شمار ادیبوں سے متعارف کرایا تھا اور جس کے دورِ پنجم میں ڈاکٹر وزیر آغا نے شریک مدیر کی حیثیت میں اس رسالے میں جدید ترین موضوعات روشناس کرائے تھے۔ اور ''ادبی دنیا'' کے کلاسیکی مزاج میں جدید نظم کو نئی کروٹ دے دی تھی۔ ان اصحاب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مولانا صلاح الدین احمد کی یادگار قائم رہے اور ان کے ادبی مشن کو جاری رکھا جا سکے۔ لیکن بعض دنیاداروں نے زیاں کے اس کاروبار کو جس میں مولانا نے اپنے تمام قیمتی اثاثے لگا دیے تھے، نفع بخش کاروبار سمجھا اور ''ادبی دنیا'' کی ترتیب و تدوین اور طباعت اور اشاعت کے لیے ایک بورڈ بنانے کی تجویز لڑھکا دی۔ وزیر آغا لاہور سے واپس آئے تو بہت افسردہ تھے۔ انہیں خدشہ اس بات کا تھا کہ ''ادبی دنیا'' کے نئے منتظمین مولانا کی اس یادگار کو زیادہ عرصے تک قائم نہیں رکھ سکیں گے اور پرچہ چھپے گا تو مولانا کے ادبی نصب العین اور فروغ اُردو ادب کے مشن سے مطابقت نہیں رکھے گا۔ (یہ دونوں باتیں بعد میں درست ثابت ہوئیں)۔ نئی انتظامیہ چند برسوں کے بعد زیاں کے اس کاروبار سے الگ ہو گئی۔ ''ادبی دنیا'' کا مالی خسارہ جناب محمد عبداللہ قریشی بھی اپنے تمام تر خلوص کے باوجود برداشت نہ کر سکے۔ اور پرچہ بند ہو گیا۔ تاہم وزیر آغا نے مولانا کی زندگی میں ان سے جو عہد کیا تھا، اسے پورا کرنے کے لیے ''اوراق'' جاری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ان کے اس ادارے کو لاہور سے قیوم نظر، عارف عبدالمتین، صلاح الدین ندیم اور شہزاد احمد نے اور سرگودھا سے غلام جیلانی اصغر، سجاد نقوی، ڈاکٹر سہیل بخاری اور عصمت علیگ نے بہت تقویت دی۔ نئے رسالے کا نام بھی شاید شہزاد احمد نے

''اوراق'' تجویز کیا تھا جو سب کو منفرد اور بامعنی لگا اور قبول کر لیا گیا۔

''اوراق'' کا پہلا شمارہ جنوری 1966ء میں شائع ہوا۔ اس آغاز میں میری حیثیت ایک تماشائی کی تھی جو کنارے پر کھڑا تخلیق و تنقید کی موجوں کو متلاطم دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ادب میں میری حیثیت مکتب سے بھاگے ہوئے ایک طالب علم کی سی تھی۔ میں نے ادبی آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا اور اس دور کے مقبول فلمی رسائل ''چترا''، ''پارس''، ''گرو گھنٹال'' اور ''پکچر'' وغیرہ سے گزر کر ماہنامہ ''بیسویں صدی''، ''چمنستان'' اور ''کہکشاں'' تک پہنچ گیا تھا۔ ان رسائل نے مجھے شہرت کی پہلی دہلیز پر قدم رکھنے کا موقع دیا تو میں آہستہ آہستہ ''آجکل''، ''نیرنگ خیال''، ''عالمگیر''، ''خیام'' اور ''ہمایوں'' تک رسائی پا گیا۔ لیکن پیشہ ورانہ عملی زندگی میں انجینئرنگ کا پیشہ اختیار کیا تو ادب کا تخلیقی سبق بھول گیا۔ اس بھولے ہوئے راستے پر مجھے دوبارہ 1966ء میں ''اوراق'' میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ڈالا۔ ''اوراق'' کے پہلے شمارے میں مجھے کتابوں کے تبصرہ نگار کی حیثیت ملی۔ میں نے محمد خالد اختر کے ناول ''چاکی وارہ میں وصال'' پر ان کے اپنے اسلوب میں تبصرہ لکھا جو پیروڈی نما تھا۔ لیکن اس کے تنقیدی زاویے میں نے خود تراشے تھے۔ سید قاسم محمود کی کتاب ''قاسم کی مہندی'' پر میرا تبصرہ تنقیدی زاویے کی وجہ سے آغا صاحب نے زیادہ پسند کیا اور مجھے ''مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوب'' پر مضمون لکھنے کی دعوت دی۔ ''اسلوب'' کے داخلی فنی مفاہیم کے مطالعے کے لیے اپنے کتب خانے سے انگریزی کتابیں بھی مرحمت فرمائیں، انگریزی کتابوں کے بالاستیعاب مطالعے کو میری فطرت ثانیہ بنانے میں وزیر آغا نے ایک خاص کردار ادا کیا۔ وہ لاہور سے نئی کتابیں خرید کر لاتے تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دیتے، شام کی مجلس میں گفتگو کا سلسلہ چلتا تو مجھے اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کرنے کے لیے کہتے اور اپنی باتوں سے ان کتابوں کے حقیقی ثمرات دوستوں میں بکھیرتے۔ ''مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوب'' میرا پہلا باقاعدہ تنقیدی مقالہ تھا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس مقالے سے ہی آغا صاحب نے میری ادبی سمت متعین کر دی اور انہوں نے نہ صرف ''اوراق'' کے لیے متعدد تنقیدی مضامین لکھوائے بلکہ ملک کے چند ممتاز ادبی رسائل میں اشاعت آزمائی کا مشورہ بھی دیا۔ ''فنون'' میں شاد امرتسری کی وفات پر میں نے ''ایک اور شہید'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا، وہ وزیر آغا کے مشورے پر ہی بھیجا گیا تھا۔ قاسمی صاحب نے اسے پسند کیا اور پھر عرش صدیقی صاحب کی کتاب ''دیدۂ یعقوب'' پر تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی دعوت دی (احمد

ندیم قاسمی کے یہ خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور مضافات کے ایک نئے لکھنے والے کے لیے ان کی ادیب نوازی کی مثال ہیں)۔

اس دور میں ''اوراق'' میں میرے جو مضامین شائع ہوئے ان میں اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش'' بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ یہ موضوع بالکل نیا تھا اور میں نے اس میں وزیر آغا کی ٹیکنیک استعمال کی تھی۔ اس ٹیکنیک میں پہلے موضوع کی بنیادی سائنس (Theory) متعین کی جاتی ہے اور پھر اس کا عملی اطلاق زیر بحث موضوع پر کیا جاتا ہے۔ یہ مقالہ اتنا پسند کیا گیا کہ جناب ساحل احمد نے اسے پھیلانے اور پوری کتاب لکھنے کی دعوت دی جو بعد میں انہوں نے الہ آباد سے شائع کی۔ اس تمام عرصے میں وزیر آغا نے نئی کتابوں کے تجزیوں اور تبصروں کا فریضہ بھی مجھے سونپا اور جو مقالات لکھوائے ان میں مسعود مفتی، رشید امجد، غلام الثقلین نقوی اور فرخندہ لودھی کے افسانوں کے تجزیے۔ اقبالیات اور غالبیات کے سلسلے کے متعدد مضامین، ادب کے معیاری اور سالانہ جائزے۔ اور جدید نظموں کے تجزیاتی مطالعات شامل ہیں۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کی پہلی کتاب ''ہم ہیں مشتاق'' مرتب ہوئی تو ان کی خواہش تھی کہ اس کا پیش لفظ وزیر آغا لکھیں لیکن آغا صاحب نے یہ کام بھی مجھے سونپ دیا اور اس کے لیے انگریزی انشائیوں اور ان پر انگریزی تنقید جو مختلف کتابوں کے پیش الفاظ کی صورت میں دستیاب تھی، پڑھائی۔ ''ہم ہیں مشتاق'' کا پیش لفظ میں نے لکھا تو اس مضمون نے اس صنفِ ادب کے بارے میں نہ صرف میرے ذہن کی اُلجھنیں دور کردیں بلکہ میرے باطن میں بھی انشائیہ لکھنے کی شمع روشن کردی۔

میں نے اپنا پہلا انشائیہ ''اونگھنا'' لکھا تو ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے اسے طنزیہ مزاحیہ مضمون قرار دے کر انشائیہ کے اس مدار سے خارج کر دیا جو وزیر آغا کی متعین کردہ تعریف کے تحت ''اوراق'' میں فروغ پا رہا تھا۔ اس ''تنقید سخن شناسی'' کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے لمبے عرصے تک ''انشائیہ'' چھپوانا ہی گوارا نہ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد سلطان رشک صاحب نے اسے سال نامہ ''نیرنگ خیال'' میں شائع کر دیا تو ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے خود انکشافی کے زاویوں سے نہ صرف ''انشائیہ'' قرار دیا بلکہ ''اوراق'' کے زیر ترتیب انشائیہ نمبر کے لیے نیا انشائیہ لکھنے کی ترغیب بھی دی۔ میرا یہ انشائیہ ''دسمبر'' کے عنوان سے شائع ہوا اور خوش قسمتی سے ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے بھی اس کی پذیرائی کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے تسلسل و تواتر سے انشائیے لکھنے پر مجھے مائل رکھا۔ تھوڑے سے عرصے میں میرا انشائیوں کا

مجموعہ ''ذکر اس پری وش کا'' تیار ہو گیا اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے مکتبہ اُردو زبان سرگودھا سے شائع کیا جس کے وہ سرپرست تھے اور نقصان مایہ سے بچانے کے لیے مالی اعانت بھی کرتے تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے جدید انشائیے کے اس دور میں مجھے انشائیہ نگاری کی طرف راغب کیا جب انشائیہ کی پہچان مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے مخالفین پیدا ہو گئے تھے۔ انشائیہ کے دفاع میں وزیر آغا نے مشتاق قمر اور جمیل آذر کے ساتھ مجھے بھی شامل کیا۔ بعد میں اسی دفاعی ٹیم میں غلام جیلانی اصغر، سجاد نقوی، رشید امجد، سلیم آغا قزلباش اور ناصر عباس نیّر بھی شامل ہو گئے لیکن میں اسے اپنا اعزاز سمجھتا ہوں کہ مجھے بھی انشائیہ کے بنیادگزاروں میں شمار کیا گیا اور میرے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ ''پتنگیں آسمانوں میں'' مقبول اکیڈمی لاہور سے چھپا تو اس پر ایک طویل تجزیاتی تبصرہ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا جو میرے لیے ''تمغۂ امتیاز'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے یہاں اس بات کا اعتراف بھی کرنا ہے کہ مجھے مصنف اور صاحب کتاب بنانے میں بھی وزیر آغا کی مساعی شامل ہیں۔ ابتدا میں نے جناب و، ع، خ کے ملفوظات کا مجموعہ ''رادھے شیام کے نام'' اور ''پھر راجہ مہدی علی خان کی نظمیں'' آغا صاحب کی راہنمائی میں ہی مرتب کی تھیں۔ تالیف وترتیب کے اس سلسلے کو دو برسوں کا ''بہترین ادب'' اور ''بہترین نظمیں'' میں توسیع ملی۔ اور انہیں مکتبہ اُردو زبان سرگودھا نے شائع کیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ''اوراق'' میں میرے مضامین کی تعداد اتنی ہو گئی کہ ایک وقیع ضخامت کی کتاب بن سکے تو وزیر آغا نے اس میں بھی دلچسپی لی اور ''فکر و خیال'' کے نام سے میری پہلی تنقیدی کتاب شائع کروائی اور واقعہ یہ ہے کہ میری متعدد ابتدائی کتابیں مثلاً ''اختلافات'' ''غالب کے نئے خطوط'' ''وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام'' اور ''شام کا سورج'' وغیرہ مکتبہ اردو زبان سے ہی شائع ہوئیں جو عملی اور معنوی طور پر آغا صاحب کا اور ماہنامہ ''اردو زبان'' سرگودھا کا ذیلی اشاعتی ادارہ تھا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے 1966ء میں ''اوراق'' لاہور سے جاری کیا تھا۔ مسعود اثر وف ڈپٹی کمشنر بن کر سرگودھا آئے تو انہوں نے اردو زبان کی خدمت میں سرگودھا کو اپنا کردار ادا کرنے کی ترغیب دی اور اس مقصد کے لیے ایک ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ مشورہ بھی دیا۔ اس رسالے کا نام ہی ''اردو زبان'' رکھا گیا۔ اور اس کا ڈیکلریشن آغا صاحب نے اپنے عزیز دوست عصمت علیگ کے نام سے لیا اور انہیں اس کا مدیر مقرر کیا گیا۔ عصمت علیگ اچھے شاعر تھے۔ ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے لیکن علی گڑھ

یونیورسٹی کی تربیت نے ان کی شخصیت پر سیاست کا غازہ چڑھا دیا تھا۔ چنانچہ ماہنامہ ''اُردو زبان'' کے تین چار پرچوں کی اشاعت کے بعد انہوں نے اپنے سیاسی امور کو فوقیت دی۔ اس دور میں میری تعیناتی سرگودھا میں ہو چکی تھی اور میں وزیر آغا کی شام کی محفلوں کا رکن بھی بن چکا تھا۔ عصمت علیگ نے ماہنامہ ''اُردو زبان'' کی ادارت سے ہاتھ کھینچا تو آغا صاحب نے اس پرچے کی ادارت میرے سپرد کر دی۔ صحافت کا کچھ تجربہ حاصل کرنے کا موقع مجھے میرے دوست عبدالرشید اشک نے اپنے اخبار ''شعلہ'' میں، اخگر سرحدی صاحب نے ''نظام نو'' میں اور انور گوئندی نے ''کامران'' میں دیا تھا لیکن وزیر آغا نے مجھے ''اُردو زبان'' کا پورا با اختیار مدیر بنا دیا تھا جس کے سرورق پر مدیران کی حیثیت میں عصمت علیگ، اور عاشق حسین جعفری کے نام چھپتے تھے۔ وزیر آغا کی عملی اور معنوی راہنمائی میں ماہنامہ ''اُردو زبان'' ایک خاص مزاج کا ادبی رسالہ بن گیا جو ادب کے علاوہ ادبی معاشرے کے حالت حاضرہ کا ترجمان بھی تھا اور اس معاشرے کی برائیوں اور ناہمواریوں کا نقاد بھی۔ پس پردہ مدیر کی حیثیت میں مجھے ''اُردو زبان'' کے لیے بہت کچھ خود لکھنا پڑتا تھا، جس نے میرے راجپوتی خون کو ہمیشہ گرم اور متحرک رکھا۔ اہم بات یہ ہے کہ دسمبر 1988ء میں جب میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گیا اور اخبارات و رسائل میں فرضی ناموں سے لکھنے کی پابندی ختم ہو گئی تو وزیر آغا نے ''اوراق'' کی ادارت میں مجھے بھی شامل کر لیا۔ اس وقت سجاد نقوی کے ساتھ وزیر آغا کے صاحبزادے سلیم آغا قزلباش بھی اوراق کی مجلس ادارت میں شامل تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے بیٹے کی جگہ مجھے دے دی اور میرے احتجاج کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ میرے لیے یہ بات باعث افتخار ہے کہ عارف عبدالمتین، سجاد نقوی اور سلیم آغا قزلباش کی طرح وزیر آغا صاحب نے ''اوراق'' کی ادارت میں میرے ادبی مشوروں کی ہمیشہ پذیرائی کی۔ میری زندگی کے '' کوائف نامے'' میں ''اوراق'' کی ادارت بھی شامل ہے۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب میں ادب سے سیاسی صحافت میں آ گیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں ''اوراق'' میں اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر ہوں تو میں نے رضا کارانہ ریٹائرمنٹ کی درخواست پیش کر دی جسے وزیر آغا نے مسترد کر دیا لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ صحافتی آداب کے تحت میرا نام ''اوراق'' کی لوح پر چھپ نہیں سکتا تو میری گزارش قبول کر لی گئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ''اوراق'' سے جو تعلق اس کے آغاز میں قائم ہوا تھا وہ اس کے آخری شمارے تک قائم رہا۔

وزیر آغا کو علم تھا کہ میں محکمہ آبپاشی میں سب انجینئر کے زیریں درجے کی ملازمت پر نا آسودگی

محسوس کر رہا تھا۔ دو محکمانہ امتحانات پاس کر لینے کے بعد بھی مجھ پر ترقی کے دروازے نہیں کھلے تھے اور میں نے پاکستان انسٹیٹیوٹ سی ایشن آف انجینئرز (ڈھاکہ) سے اے، ایم، آئی، ای (A.M.I.E) کے امتحانات پاس کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا جو بی ایس سی کے مساوی تسلیم کیے جاتے تھے۔ بارہ پرچوں کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ڈیزائین کا پرچہ اڑا ہوا تھا۔ اس میں صرف ایک سوال آتا تھا اور آپشن (Option) نہیں ہوتا تھا۔ چوتھی یا پانچویں دفعہ جب کامیابی کی امید نظر نہ آئی تو وزیر آغا نے مجھے ایم اے (اُردو) کرنے کا مشورہ دیا۔ سجاد نقوی نے داخلے فارم پر میرے دستخط کرائے اور وزیر آغا نے مارچ کے مہینے میں دوگنی فیس ادا کر کے مئی میں ہونے والے ایم اے کے امتحان کے لیے میری درخواست پنجاب یونیورسٹی کو بھیج دی۔ اس کے ساتھ ہی ''شام دوستاں'' میں بحث کے لیے صرف ایم اے کے موضوعات متعین کر دیے۔ اس راہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس امتحان میں یونیورسٹی میں اوّل آ گیا۔ پرائیویٹ طلبا میں نیا ریکارڈ قائم کیا جو ابھی تک توڑا نہیں جا سکا۔ دو طلائی تمغے حاصل کیے۔ غلام اصغر جیلانی صاحب نے میری اس کامیابی کو وزیر آغا کے نام معنون کیا۔ اسی سال میں اے، ایم، آئی، ای کے تیرھویں پرچے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا اور ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے پر ترقی پانے کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ سجاد نقوی اور غلام جیلانی اصغر کا مشورہ تھا کہ میں محکمہ آبپاشی چھوڑ کر محکمہ تعلیم میں شامل ہو جاؤں لیکن وزیر آغا نے آبپاشی کے محکمے کو ترجیح دی جہاں میں تقریباً پندرہ برس گزار کر ایس ڈی او کے عہدے پر ترقی حاصل کر چکا تھا۔ بعد کے حالات نے اس حقیقت کا اثبات کرایا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کا مشورہ درست تھا۔

ایم اے اوّل بدرجہ اوّل پاس کرنے کے بعد وزیر آغا نے ہی مجھے پی ایچ ڈی کرنے کی راہ دکھائی، اس وقت میرا ایک مقالہ ''اردو کی دو ادبی تحریکیں'' رسالہ ''ماہِ نو'' میں شائع ہو چکا تھا۔ وزیر آغا نے اس مقالے کو ڈاکٹریٹ کا ابتدائی خاکہ قرار دیا اور ایک دن اورینٹل کالج کے شعبہ اُردو کے صدر وقار عظیم صاحب کے پاس لے گئے لیکن انہوں نے اس موضوع کی پذیرائی نہ کی، ان کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی صدر شعبہ اردو بنے تو انہوں نے میرا خاکہ لے کر اپنے پاس رکھ لیا لیکن چار پانچ سال تک منظوری کے لیے ''بورڈ آف سٹڈیز'' کے سامنے پیش نہیں کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ منظوری مجھے اپنے دور میں دلائی اور اس مقالے کے داخلی نگران بھی وزیر آغا کو مقرر کیا۔ موضوع سے متعلقہ کتابوں کے مطالعے کے بعد میں نے اس مقالے کا پہلا باب لکھا تو وزیر آغا نے اسے غیر معیاری کہہ کر مسترد کر دیا۔ تیسرے

استرداد پر میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر بلند بانگ آواز میں انہیں کہا کہ ''محکمہ آبپاشی کے اس ایس ڈی او کے لیے پی ایچ ڈی کی ڈگری چنداں اہمیت نہیں رکھتی'' اور جو کاغذات مسترد ہوئے تھے ان کے سامنے پھاڑ دیے۔ وزیر آغا یہ ڈرامہ دیکھ کر مسکراتے رہے۔ اگلے روز میرے گھر تشریف لائے تو اپنے ساتھ نئی کتابوں کا انبار بھی لائے۔ کہنے لگے: آپ نے پی ایچ ڈی کا ارادہ ترک کیا ہے، مطالعہ تو ترک نہیں کیا۔ میں آپ کے ذوق کی کچھ کتابیں لایا ہوں۔ کچھ دن ان کی معیت میں گزاریے۔''

اب جو یہ کتابیں دیکھیں تو اپنے مقالے کے ابتدائی باب کی بے وقعتی کا احساس ہوا اور میں پھر اس موضوع پر کام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ آغا صاحب نے یہ باب مجھ سے سات مرتبہ لکھوایا اور پھر مجھے لاہور لے آئے تاکہ میں یہ مقالہ حلقہ ارباب ذوق میں پیش کروں۔ اس اجلاس میں سجاد باقر رضوی، انتظار حسین، رحمان مذنب، انجم رومانی اور سراج منیر جیسے لوگ موجود تھے جنہوں نے مقالے کو صبر وتحمل سے سنا لیکن بحث میں اس کے پرخچے اُڑا دیے۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی لیکن جب ٹی ہاؤس میں آئے تو ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے میری پیٹھ تھونکی اور وزیر آغا کی تحسین کی کہ وہ ایک اہم موضوع پر بڑی محنت سے اپنی نگرانی میں مقالہ لکھوا رہے تھے۔ رضوی صاحب نے مجھے بالخصوص کہا کہ ''حلقے کی آج کی تنقید کو بالکل اہمیت نہ دوں۔ اور اپنا کام جاری رکھوں۔'' اس مقالے کے خارجی ممتحن ڈاکٹر شمس الدین صدیقی اور ڈاکٹر سید عبداللہ تھے۔ میرا زبانی امتحان بھی سید صاحب نے لیا جس میں داخلی نگران کی حیثیت میں وزیر آغا بھی موجود تھے۔ انٹرویو کے اختتام پر انہوں نے مجھے ''ڈاکٹر'' کہہ کر مخاطب کیا اور وزیر آغا کو مبارک باد دی کہ یہ مقالہ اپنی نظیر آپ ثابت ہوگا۔ اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اگر وزیر آغا میرے نگران مقرر نہ کیے جاتے تو شاید میں یہ مقالہ نہ لکھ سکتا اور پی ایچ ڈی کا اعزاز بھی حاصل نہ کر سکتا۔ میرا ادب کا ریاض آغا صاحب نے ہی پورا کر دیا تھا۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ انجینئرنگ کے شعبے میں داخل ہونے کے بعد میں ادب کی اقلیم سے خارج ہو چکا تھا۔ وزیر آغا سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے اس بھیدوں بھری دنیا میں نہ صرف واپس لائے بلکہ اس کے اسرار کھولنے کی تربیت بھی دی۔ مجھے مطالعے کا ذوق و شوق عطا کیا۔ اختلافی نکتہ اُبھارنے اور اسے نرم روی سے پیش کرنے کا انداز سکھایا۔ نئے سوال کی اہمیت کا احساس دلایا اور پھر اپنی بات جرأت مندی سے کہنے کا حوصلہ بھی دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے میرے اندر سے انشائیہ نگار اور شاعر کو بھی

بیدار کیا جن سے میں بالکل نا آشنا سا تھا۔اب میں اپنی زندگی کی جس جہت کو بھی دیکھتا ہوں اس میں وزیر آغا کے ادبی نقوش اور اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ سب کچھ جمال ہم نشیں ہی نہیں بلکہ اس معراج کا آئینہ دار ہے جہاں ''من وتو'' کے فاصلے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔میرا غم یہ ہے کہ 7 ستمبر 2010 کو کارکنان قضاوقدر نے ''یہ من وتو'' کا رشتہ توڑ دیا۔اب میں شدید اکلاپے کا شکار ہوں۔اپنے مسکن میں در ودیوار کو دیکھ رہا ہوں۔سامنے ٹیلیفون پڑا ہے جس کی گھنٹی تو بجتی ہے لیکن وزیر آغا صاحب کی آواز نہیں آتی۔یہ غم محرومی جاوید ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے آخری ملاقات

ادبی اعتبار سے اگر چہ ڈاکٹر وزیر آغا سے میں اس زمانے سے شناسا تھا، جب ان کی نظمیں شاہد احمد دہلوی کے رسالہ ''ساقی'' دہلی اور مرزا ادیب کے رسالے ''ادب لطیف'' لاہور میں چھپتی تھیں۔ ان کے مضامین میں نے مولانا صلاح الدین احمد کے رسالے ''ادبی دنیا'' لاہور میں بھی پڑھے تھے۔ اُردو شاعری کا ایک سال کا جائزہ محمد طفیل کے رسالے ''نقوش'' میں چھپا تو اس کی دھوم ہر طرف مچ گئی تھی۔ اس مضمون کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں وزیر آغا نے نامور شعرا کی نظموں اور غزلوں کے ساتھ ان نئے اور نوجوان شعرا کا تذکرہ بھی بے حد تحسین آمیز انداز میں کیا تھا جو ادب میں اس وقت معروف نہیں ہوئے تھے۔ اس مضمون کی جامعیت پر مدیر ''نقوش'' نے خصوصی ''نوٹ'' درج کیا تھا۔ شاید انہیں نوجوان شعرا کے تذکرے پر اعتراض تھا کہ وزیر آغا نے ان کی تحسین ان کی ادبی بلوغت سے پہلے کر دی تھی اور یہ شعرا اس تعریف میں کھوئے جا سکتے تھے۔ میں اس مضمون پر اب نظر ڈالتا ہوں تو محمد طفیل ..... کا خدشہ جزوی طور پر درست نظر آتا ہے۔ وزیر آغا نے اس مضمون میں نئے شاعروں کی جو کہکشاں بنائی تھی اس کے کچھ ستارے بعد میں زندگی کے گھمسان میں گم ہو گئے لیکن جن نوجوانوں نے اس تحسین سے تخلیق کاری کی تحریک حاصل کی انہوں نے اپنی شاعری میں ارتقاء کا اگلا قدم اُٹھایا اور آج ادب کی کہکشاں انہیں کے ناموں سے منور ہے۔ اور یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ وزیر آغا نے ان نوجوان شعرا کے تخلیقی جوہر کو پہچان لیا تھا اور انہیں ادب کی طرف راغب رہنے کی کاوش کی تھی۔

محکمہ آبپاشی کے ایک کارکن کی حیثیت میں میری تعیناتی نواح لاہور میں بیدیاں کے مقام پر

ہوئی تو مجھے لاہور آنے کا موقع جب کبھی ملتا میں وائی۔ایم،سی،اے کے بورڈ روم میں حلقہ ارباب ذوق میں سامع کے طور پر ضرور شرکت کرتا تھا۔ میں نے حلقے میں جو وزیر آغا کے مضامین سنے ان میں سے ''انشائے لطیف کیا ہے؟''......''میرا جی''......اور''افسردہ دلی کی ایک مثال'' مجھے یاد ہیں۔آخر الذکر مضمون قیوم نظر کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ تھا، جس کے بعض نو کیلے نکات نے بحث کو آتش فشاں بنادیا۔ قیوم نظر خود بھی اس محفل میں موجود تھے۔اجلاس ختم ہوا تو آگے بڑھ کے وزیر آغا سے گلے ملے اور انہیں اپنے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں لے گئے جہاں بعد از اجلاس حلقے کے ادیبوں کی محفل غیر رسمی انداز میں جمتی تھی۔قیوم نظر حلقہ ارباب ذوق کے بنیاد گزاروں میں شامل تھے۔وہ بہت سینئر شاعر تھے اور جس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے اس کا ادبی جوہر چمکا دیتے تھے اور بحث بھی خوب چنچتی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ بحث کے دوران اور پھر پاک ٹی ہاؤس کی مجلس میں قیوم نظر اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگا کر بعض نکات پر وزیر آغا کو داد دیتے رہے۔وزیر آغا کا یہ مضمون بعد میں ان کی کتاب ''نظم جدید کی کروٹیں'' میں شائع ہوا۔قیوم نظر کی شاعری پر جناب ریاض احمد نے پوری ایک کتاب لکھی ہے لیکن ان سے ملاقات ہوتی تو وہ وزیر آغا کے مضمون کی زیادہ تعریف کرتے۔کیوں کہ یہ مضمون ایک ایسے ادیب نے لکھا تھا جو قیوم نظر کے قریبی دوستوں میں شامل نہیں تھا جب کہ ریاض احمد ان کے عزیز ترین دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔

میں اس طویل جملہ معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں۔اس پس منظر میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ساٹھ کی دہائی سے قبل مجھے وزیر آغا سے وجودی طور پر ملنے،ان سے باتیں کرنے اور ان سے فیض حاصل کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ایک دفعہ مختصر تعطیل پر سرگودھا آیا تو سجاد نقوی صاحب نے میرا اشتیاق دیکھ کر ان سے بالمشافہ ملاقات کا اہتمام کیا۔اس کے بعد میں جب کبھی چھٹی پر سرگودھا آتا وزیر آغا سے ملنے کے لیے ان کی زیر تعمیر کوٹھی پر ضرور حاضری دیتا۔رسالہ'' کامران'' کے مدیر انور گوئندی نے سالنامہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو اس کا فارمیٹ (Format) بنانے کے لیے وزیر آغا کے گاؤں جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔آغا صاحب سے یہ پورے دن کی طویل ملاقات تھی جس میں نہ صرف'' کامران'' کے سالنامے کے لیے تجدد آفریں موضوعات طے کیے گئے بلکہ ان موضوعات کے گردوپیش میں بھی سیر حاصل باتیں ہوئیں۔

یہ پہلی انفرادی ملاقات تھی جو مجھے وزیر آغا کے قریب لے آئی۔اب حسنِ اتفاق دیکھئے کہ

جنوری 1964ء میں میرا تبادلہ، بیدیاں ضلع لاہور سے سرگودھا میں ہو گیا۔ اس وقت تک آغا صاحب بھی اپنی کوٹھی کی تعمیر مکمل کر کے شہر میں منتقل ہو چکے تھے اور ہر شام ایک محفل ادب سجاتے تھے جس میں سرگودھا کے ادبائے کرام اپنی فرصت کی صوابدید کے مطابق شامل ہوتے اور ادب کے متنوع موضوعات پر غیر رسمی انداز میں رات گئے تک سلسلہ بحث و کلام جاری رکھتے۔ میں اپنے دفتر کا کام ختم کر کے گھر آ جاتا لیکن جوں ہی شام کے سائے ڈھلنے لگتے، میری سائیکل کا پہیہ وزیر آغا کی کوٹھی کی طرف رواں ہو جاتا۔ اس محفل میں آغا صاحب کی وساطت سے میری ملاقات میر عبدالرشید اشک، غلام جیلانی اصغر، جوہر نظامی، محمد حسین شوق، پرویز بزمی، مرزا ریاض، خورشید رضوی، مرزا منور، ایم ڈی شاد اور رحمان قریشی جیسے لوگوں سے ہوئی جو علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور ان میں سے بیشتر خود بھی ادب دوست تخلیقی شعرا تھے۔ سجاد نقوی اور انور سدید (راقم) کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ہم دونوں ہر شام وزیر آغا صاحب کا فیضِ صحبت حاصل کرنے کے لیے باقاعدگی سے حاضر ہوتے تھے اور میں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ جس روز آغا صاحب سے ملاقات نہیں ہوتی تھی میں اس دن کو اپنی زندگی میں شمار نہیں کرتا تھا۔ اور اب میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ 1964ء کے بعد ان سے صرف ایک طویل ملاقات ہوئی جو 2010ء تک پھیلتی چلی گئی۔ اس مسلسل ملاقات کو ستمبر 2010ء میں قضا و قدر نے منقطع کر دیا۔ یعنی وجودی طور پر ان سے ملنا، ان سے باتیں کرنا اور ان سے فیض حاصل کرنے کے امکانات ختم ہو گئے تھے کیوں کہ وہ عالمِ بالا کو سدھار گئے تھے۔ اور میں جو ان کے یکے از پسماندگان میں شمار کیا گیا ہوں کہہ رہا ہوں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے　　　آج وہ کل ہماری باری ہے

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مجھے 4 دسمبر 2008ء کو ریڑھ کی ہڈی میں خلا پیدا ہو جانے کی وجہ سے دائیں ٹانگ میں شیاٹیکا درد (عرق النساء) نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ نقل و حرکت اور چلنا پھرنا موقوف ہو گیا۔ ادھر آغا صاحب بھی اپنی عمر کے 85ویں سال کے بعد چند بیماریوں کا سامنا کر رہے تھے۔ ان کی چہل قدمی بھی گھر کے سرسبز لان تک محدود ہو گئی تھی۔ لیکن ہمارا ٹیلیفون سے رابطہ مسلسل قائم رہتا تھا۔ انور محمود خالد یا ظفر علی راجہ کبھی کار لے کر آ جاتے تو آغا صاحب سے ملاقات کا سبب پیدا ہو جاتا۔ اب یاد آ رہا ہے کہ انور محمود خالد نے 19 اگست 2010ء کو فیصل آباد سے مجھے بتایا تھا کہ وہ اگلے روز 20 اگست 2010ء لاہور آ رہے ہیں اور وزیر آغا صاحب سے ملاقات ان کے ایجنڈے میں فوقیت رکھتی

ہے۔انہوں نے مجھے دس بجے صبح تیار رہنے کا حکم دیا تھا کہ وہ مجھے میرے گھر سے لیں گے۔اس پروگرام کی اطلاع انہوں نے وزیر آغا صاحب کو فیصل آباد سے دے دی تھی اور جب ہم دونوں ان کے دولت کدہ 115 سرور روڈ پر پہنچے تو وہ اپنے کمرے میں ہمارے منتظر تھے۔لیکن میرا ماتھا ٹھنکا وہ پلنگ پر پڑی ہوئی کتابوں کے انبار میں لیٹے ہوئے تھے اور کمزور نظر آ رہے تھے۔چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھیں۔ہمیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی تو خالد صاحب نے آگے بڑھ کر کہا" ڈاکٹر صاحب لیٹے رہیئے!" تکلیف کے آثار ان کے چہرے سے عیاں تھے۔اور بہت مضمحل دکھائی دے رہے تھے۔لیکن ان کی مسکراہٹ ان کی طبعی رجائیت کی آئینہ دار تھی اور چند لمحوں کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ پہلے پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گئے اور پھر خود ہی ہمارے پاس کرسی پر آ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

خالد صاحب نے برسبیل عیادت چند جملے کہے تو یہ بھی پوچھا کہ آپ علالت میں کیا کرتے ہیں؟ وزیر آغا نے بتایا کہ" مجھے بچپن میں ٹائی فائیڈ ہو گیا تھا ان دنوں اس مرض کا علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔بخار تو اتر گیا لیکن معدے پر اپنے منفی اثرات چھوڑ گیا اور مستقل علیل رہنے لگا۔دراصل میرے جسم کی ہڈیاں کمزور ہو گئی تھیں بعد ازاں جسم کی شاخ اپنے فطری انداز میں کبھی ہری نہیں ہوئی اور علالت میری زندگی میں مستقل طور پر شامل ہو گئی۔اب میں اس کے ساتھ ایک دوست کا سلوک کرتا ہوں،" ہنس کر کہنے لگے انور سدید کو ذرا سی بیماری آ جائے تو پوری ادبی دنیا میں شور بپا کر دیتا ہے۔میں اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتا۔دکھ کو خود ہی جھیلتا ہوں اور اس سے سمجھوتہ کر لیتا ہوں۔یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ آغا صاحب کا ملازم خلیفہ چائے کی ٹرالی لے آیا اور آغا صاحب خود چائے بنانے لگے۔میری نظر کتابوں کے شیلف پر گئی تو اس پر آٹھ دس کتابوں کا ایک بنڈل پڑا تھا۔آغا صاحب نے چائے کی پیالی انور محمود خالد کی طرف بڑھا کر اس بنڈل میں سے دو کتابیں نکالیں اور بتایا۔

"تخلیقی عمل" کا نیا ایڈیشن شہزاد احمد نے "مجلس ترقی ادب" سے شائع کیا ہے۔اس کی چند جلدیں آج ہی ملی ہیں۔اچھا ہوا آپ آ گئے ہیں۔اب کتابیں ڈاک سے نہیں بھیجنی پڑیں گی۔"

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "تخلیقی عمل" 1970ء میں پہلی دفعہ منظر عام پر آئی تھی اور اسے ایک انقلاب آفریں تحقیقی نظریات کی کتاب قرار دیا گیا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کتاب میں معاشرہ (سوسائٹی) اسطور، تاریخ، فنون لطیفہ اور حیاتیات کے تخلیقی عمل کا تجزیہ کیا گیا تھا۔آغا صاحب

کے نزدیک ''تخلیقی عمل اصلاً وہ عمل تھا جس کی مدد سے انسان اپنے ہی وجود کی بامشقت قید سے رہائی پاتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شے کسی مدار میں مسلسل گھومتے چلے جانے کے بعد معاً لپک کر ایک نئے اور کشادہ مدار میں چلی جائے۔'' سوچ کا یہ نقطہ کثیر الجہت تھا اور وزیر آغا اس پر مسلسل سوچنے لگے تو سائنس اور فلسفے کے مطالعے کی روشنی میں مختلف نکات کی گرہیں کھلنے لگیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ'' جسم، معاشرہ، اسطور، تاریخ اور فن ہی میں نہیں کائنات کے محیط و بسیط نظام میں بھی اس کا یہی اصول کارفرما ہے؟''......

وزیر آغا صاحب کی ابتدائی تربیت میں ان کے والد گرامی آغا وسعت علی خان (و، ع، خ) جو سالک راہ حق تھے اور جستجوئے صداقت میں نہ صرف تصوف کی گہرائیوں میں اُترے تھے بلکہ انہوں نے ویدانت کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اور اس کا جوہر وزیر آغا کو بھی منتقل کیا تھا، چنانچہ جب وہ مختلف مظاہر حیات و علم و دانش کے تخلیقی عمل کی گتھی سلجھا رہے تھے تو حقیقت اولیٰ کی تفہیم کی کاوش بھی کی۔ انہوں نے لکھا ہے۔

''حقیقت اولیٰ'' بھی جو وحدت کی علمبردار اور نام روپ سے بے نیاز ہے، اپنے تخلیقی عمل میں وہ واضح سطحوں کا احساس دلاتی ہے۔ ایک خود فراموشی کی سطح جو سکون اور ٹھہراؤ سے عبارت ہے اور دوسری ایک جہد مسلسل کی سطح جو بے قراری اور کلبلاہٹ کی مظہر ہے اور جو لازمی طور پر پہلی سطح کے سکون سے نمودار ہوتی ہے مگر اس طور کہ اس کا اچانک ظہور تجلیات کے ایک نئے سلسلے کا نقطہ آغاز قرار پاتا ہے۔''

تخلیقی عمل کا یہ اجمال ڈاکٹر انور محمود خالد اور میرے ذہن میں موجود تھا اور میں اس حقیقت سے بھی آشنا تھا کہ اس کتاب پر پاک و ہند کے علمی حلقوں میں خوب بحثیں چلی تھیں اور ربع صدی کے عرصے میں اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے تھے اور 2003ء میں چھٹے ایڈیشن کا مرحلہ آیا تو آغا صاحب نے اس میں ایک نئے باب ''تیس برس بعد'' کا اضافہ کیا جس میں انہوں نے بیسویں صدی کی نئی تنقیدی تھیوری کے تحت اُبھرنے والے فکری مباحث کو زیر بحث لانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اور وہ فکری لحاظ سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تخلیقی عمل میں ''تقلیب'' سے پہلے ''نراج'' کا مرحلہ لازمی طور پر آتا ہے اور ''نراج'' کے بھی تین درجے ہیں۔

اوّل۔ ''جب انجماد طاری ہو جاتا ہے۔''

دوم۔ ''جب پیکار'' بپا ہوتا ہے جس میں عناصر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں''

سوم۔ '' بے ہئیتی کا دور جس میں عناصر کی ایک الگ الگ پہچان معدوم ہو جاتی ہے اور اس

بے ہیئتی کے اندر سے باہر کی طرف ایک جست لگتی ہے۔

اس جست کا نام ہی زندگی ہے۔''

''تخلیقی عمل'' کا ساتواں ایڈیشن چھپا تو وزیر آغا کی سوچ ارتقاء کا اگلا قدم اٹھا چکی تھی۔ اس وقت طبعیات نے کائناتِ اکبر اور کائناتِ اصغر میں اتنی دور تک پیش قدمی کر لی تھی کہ وزیر آغا کائنات کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کی سعی کرنے لگے اور آٹھویں ایڈیشن کے لیے انہوں نے طبیعات کے حوالے سے ایک نیا باب لکھا۔ ہم دونوں کو یہ کتاب دیتے ہوئے ان کے چہرے پر ایک مسرت آفریں لہر دوڑتی نظر آئی جو اس طمانیت کی مظہر تھی کہ بیماریوں کہ اس دور میں ان کی کتاب ''تخلیقی عمل'' کا آٹھواں ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن چھپ گیا تھا۔ اب اس کتاب پر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ڈاکٹر انور محمود خالد اور میری حیثیت محض دو مستعجب سامعین کی تھی جو کبھی کبھی اور کہیں کہیں اپنی وضاحت کے لیے سوال بھی پوچھ لیتے تھے۔ اور ڈاکٹر وزیر آغا اس موضوع پر معلومات کے خزانے ہم پر نچھاور کرنے لگتے تھے۔ مثلاً انور محمود خالد نے صرف یہ پوچھا کہ کائنات کیا ہے؟ اور ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

> '' کائنات ایک ایسا پارچہ یعنی فیبرک (Fabric) ہے جس میں کشش ثقل کی کشوں، قوسوں اور دھاگوں نے بُنت کاری کی ہے۔ اور یہ عمل زمان و مکاں کی اس شکل میں ظاہر ہے جو کرہ کی صورت میں سامنے ہے اور ایک Gently curving geometrical پر منتج ہے۔ بیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں کے دوران طبیعات کے نظریہ اضافیت نے '' کائنات اکبر'' اور کوانٹم میکانکس'' نے کائنات اصغر کو جاننے کی کوششیں کی تھیں اور نظریہ اضافیت نے کائنات اکبر کے پھیلاؤ میں ایک انوکھی تنظیم اور '' ہر منی'' کا احساس دلایا تھا۔ کائنات سو ارب کہکشاؤں پر مشتمل ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ کائنات اکبر ہمہ وقت پھیل رہی ہے۔ یہ کائنات تفسیر آشنا ہے لیکن کائناتی قوانین کے تابع ہے اور اپنی ساخت کو بھی قائم رکھے ہوئے ہے۔''

کائنات کے آغاز کے بارے میں انہوں نے قیاس آرائیوں کے برعکس ریاضی دانوں کے اس فیصلے کا ذکر کیا جس کے تحت تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ہماری یہ کائنات آج سے 1307 ءارب سال پہلے ایک

بہت بڑے دھماکے کے (Big Bang) سے وجود میں آئی تھی۔ اور یہ دھماکہ اس مقام پر ہوا تھا جو زمان و مکاں کی آخری حد ہے اور جس کے پیچھے محض عدم ہے۔ اس مقام کو "پلانک لینگتھ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس کا تعین مشہور سائنس دان پلانک نے کیا تھا۔ اس "دریافت" کے قریباً 70 برس کے بعد سوال اٹھایا گیا کہ ٹائم اور سپیس کی آخری حد کے پیچھے بھی ضرور کچھ موجود ہے۔ اور وہ کیا ہے؟ آخر 1990ء کی دہائی میں یہ بتایا گیا" پلانک لینگتھ" کے پیچھے وہ مقام ہے جہاں کائنات کی چاروں بڑی قوتوں۔۔۔ الیکٹرو میگنیٹک فورس، سٹرانگ فورس، ویک فورس اور کشش ثقل کی اکائی موجود ہے۔ اس کے بعد ایم تھیوری متعارف ہوئی تو انکشاف کیا گیا کہ پلانک ٹائم اور سپیس کے عقب میں ایک "الٹرا مائیکرو سکوپک لیول" (Ultra micro scopic level) بھی ہے جس میں روایتی زمان اور مکاں...... آگے اور پیچھے...... اور اوپر اور نیچے کی سمتیں موجود نہیں۔ یہ بے مقام۔۔۔" مقام" ایک ڈارک انرجی" (Dark energy) یا کالی قوت (شکتی) سے لبریز ہے جس میں انرجی (Energy) کا طوفان برپا ہے جو اصلاً "نراج (Chaos) ہے۔"

اور کائنات کی تخلیق کے نقطے کی طرف آئے تو ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا

> "نراج کے اس عالم سے ایک کوندا لپکتا ہے...... یہ بگ بینگ (Big Bang) ہے جس سے ہماری کائنات کی ابتداء ہوئی تھی۔ جست اور کوندا اپنی Thrust کے اعتبار سے ہم معنی ہیں لیکن جست کی کارکردگی زمینی مظاہر تک ہے جب کہ" کوندا" کائناتی سطح کی زقند کا نام ہے۔ اور ایک ایسی تخلیق پر منتج ہوتا ہے جو کہکشاؤں ستاروں اور سیاروں پر مشتمل اور آپ کے رشتوں کے جال (Web of relations) کے تابع ہے۔"

معنوی طور پر وزیر آغا صاحب نے ثابت یہ کیا کہ حیاتیات، اسطور، تاریخ، معاشرہ اور فنون لطیفہ کی طرح کائنات کا تخلیقی عمل بھی نراج، جست اور تجسیم کے تابع ہے اور فنون لطیفہ کے حوالے سے ان کا نکتہ یہ تھا کہ" تخلیق کار کے اعماق میں ایک ایسی کیفیت جنم لیتی ہے جو ایک بے جہت اور بے صورت "احساس" پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ احساس" نراج" کے عالم میں ہوتا ہے۔ مگر پھر اپنی ساری قوت کو یکجا کر کے ایک ایسی جست بھرتا ہے جو اس کو اس عالم سے آزاد کر کے" چیزے دیگر" بنا دیتی ہے...... "اسے آپ

ادبی شہ پارے کا عنوان بھی دے دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا تخلیقی عمل کے ایک نئے باب کی وضاحت کر رہے تھے تو اس میں ایسے مگن ہوئے کہ اپنی علالت کو یکسر بھول گئے اور دو تین گھنٹے کی اس پر مغز بات چیت کے دوران ان کے اندر اتنی قوت پیدا ہوگئی کہ ہم نے رخصت چاہی تو اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔ اور پوچھا "انور محمود خالد صاحب! پھر کب آئیں گے؟" ڈاکٹر خالد بولے "میں شاید 31 اگست کو لاہور آؤں گا۔"

وزیر آغا نے ان سے رخصتی کا ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "یہاں ضرور آئیں اور انور سدید کو ساتھ لائیں، میں نے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ قومی بین الاقوامی اور کائنات کی گتھیاں سلجھانی ہیں" انور محمود خالد آخری بات سن کر ہنسے۔ افسوس یہ ہے کہ ڈاکٹر انور محمود خالد 31 اگست کو لاہور نہ آسکے اور یکم ستمبر 2010ء کو انہوں نے فیصل آباد سے فون کیا تو معلوم ہوا کہ وزیر آغا صاحب ہسپتال میں داخل ہیں جہاں سے وہ زندہ گھر نہ لوٹے۔ اور 19 اگست 2010ء کی ملاقات ہی ان سے زندگی کی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ 8 ستمبر 2010ء کی شام کو انور محمود خالد اور میں نے ان سے وزیر کوٹ میں ملاقات کی لیکن اس وقت آغا صاحب ابدی نیند سوئے ہوئے تھے۔

وزیر آغا کی شخصیت

مجھے اس اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ وزیر آغا کی زندگی اور ادبی شخصیت کے گوشے متعدد ہیں، اول الذکر کے تحت انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ اقتصادیات میں ایم اے کیا۔ ''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ کاشتکاری کو جزو زندگی بنایا اور پھر اپنے بچوں کو زندگی میں مناسب طور پر اپنا مقام بنانے کے لیے ان کی راہنمائی کرتے رہے۔ مؤخر الذکر کے تحت انہوں نے انشائیہ، جدید نظم، نئی اردو غزل اور تنقید میں ناموری حاصل کی۔ اپنا الگ دبستان ادب پیدا کیا اور لکھنے والوں کے ایک بڑے حلقے کو فکری طور پر متاثر کیا۔ ان کے ادبی نظریات سے نئے نئے مباحث ابھرے اور تنقید کو آگے بڑھنے میں مدد ملی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک دفعہ ان کے ادبی کام پر نظر ڈالتے ہوئے لکھا تھا کہ

> ''وزیر آغا کی ہر تحریر میں ادب و فن کے منبع و ماخذ کی تلاش اور کائنات وزندگی کی حقیقت کی جستجو ہے۔ وہ ہر حقیقت کا تجزیہ کرتا ہے اور اسباب وعلل سے بحث کرتا ہے......''

ڈاکٹر سید عبداللہ کی یہ رائے، میں نے وزیر آغا کی کسی کتاب کے دیباچے سے اقتباس نہیں کی بلکہ یہ ایک بڑے اور بزرگ ادیب کا ایسا خراج تحسین ہے جو صرف اس وقت معرض تحریر میں آتا ہے جب کسی ادیب کو شرف پذیرائی اس کا دل دینے پر آمادہ ہو۔ میں نے اُس وزیر آغا کو جو مصنف ہے اور اُس وزیر آغا کو جو لفظ لفظ بن کر کتابوں میں سما گیا ہے، متعدد مرتبہ موضوع بنایا، اس تمام عرصے میں مجھے کئی مرتبہ اتفاق اور اختلاف کی منزل سے گزرنا پڑا۔ تشنگی محسوس ہوئی تو وزیر آغا کی فکری صداقتوں سے پیاس

بجھائی۔ طمانیت محسوس کی تو اس کا تذکرہ دوستوں سے کیا کہ وہ بھی وزیر آغا کو پڑھیں اور حقیقت کی تلاش میں وزیر آغا کے نقوشِ پا پر چلیں۔ مجھے ان کے مطالعے میں نئی نہائیتوں کو حاصل کرنے کا موقع ملتا تو کائنات کی کثافت رنگوں کی جوالا میں بدل جاتی اور میں اس جوالا میں نہانے لگتا۔ میرے نزدیک یہ وزیر آغا کا روپ ازلی بھی تھا اور ابدی بھی اور ان سے میرے تعارف کا یہی وسیلہ تھا۔

میرے افتخار میں اس حقیقت کا عمل دخل بھی ہے کہ مجھے وزیر آغا کے قریب رہنے، ان کے شب و روز کا مطالعہ کرنے، ان کے افکار و تصورات کو مقالات میں ڈھالنے اور ان کی بہت سی تخلیقات کے اوّلیں مسودے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے مختلف موضوعات پر کام کرتے ہوئے ان سے متعدد مرتبہ راہنمائی حاصل کی۔ ''اردو ادب میں تحریکیں'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے، پنجاب یونیورسٹی نے وزیر آغا کو میرا نگران مقرر کیا تھا لیکن انہوں نے تحقیقی راہنما کے بجائے اس راہنما ستارے کا فریضہ انجام دیا جو راستہ دکھاتا ہے۔ میں نے ان پر زندگی کی مسرت کو انوار بن کر اترتے دیکھا اور شدید ترین افسردگی کے اس عالم کا مطالعہ بھی کیا، جب ایک چھوٹی سی بات ان کے نظامِ سکون کو درہم برہم کر دیتی اور وزیر آغا جسم اور روح میں توازن پیدا کرنے کے لیے ادب میں کھو جاتے تھے۔

وزیر آغا نے عزلت گزینی کبھی اختیار نہیں کی اور وہ روایتی معنوں میں کبھی تنہا نہیں ہوئے۔ میں نے ان کی انجمن کو ہر وقت آراستہ دیکھا۔ گاؤں میں ہوتے تو ان کے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور، پرندے، شجر اور ندیاں ان کے ساتھ شامِ دوستاں آباد کرتے۔ شہر میں ہوتے تو غلام جیلانی اصغر، سجاد نقوی، جمیل یوسف، خورشید رضوی، پرویز بزمی، انجم نیازی، راغب شکیب کے بغیر ان کی شام آباد نہ ہوتی۔ وہ انسان کو اس کی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرتے اور جو بھی ان کے قریب آتا اسے فوری طور پر اپنے دوست کا افضل ترین مقام دے دیتے۔ انہوں نے اپنے آپ کو کبھی عظیم تصور نہیں کیا کہ عظیم انسان دنیا میں صرف ایک آیا ہے اور وہ حضور نبی اکرمؐ تھے۔ ان کے سوا کسی اور انسان کو عظیم کہلانے کا حق نہیں۔ وہ اپنے آپ کو محض انسان تصور کرتے، غم اور خوشی کے جذبات کو قبول کرتے اور ان کا گہرا اثر لیتے تھے۔ وہ شخصیت کے زاویے کو خارج کے ساتھ متعلق نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ داخلی زاویے کو اہمیت دیتے اور کسی شخص کی خامیوں کو اُچھالنے کے بجائے ان گوشوں کی تحسین کرتے، جن سے انسانی قدروں کو فروغ ملتا اور دکھی انسان شانت ہو جاتا ہے۔

مجھے وزیر آغا سے مل کر ہمیشہ خوشی کی ایک نئی نہایت ملتی تھی اور پھر میں اپنی ذات کے کھردرے کناروں کو ہموار کرنے لگتا۔ تاہم وہ مجھے انسانیت سے ماورا کبھی نظر نہیں آئے، وہ بشری کمزوریوں سے جنگ کرتے اور ان پر فتح یاب ہو کر آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے، تو مجھے معلوم ہوتا جاتا کہ انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کو مثبت رویّوں میں ڈھالنے کے لیے کتنی ریاضت کی تھی۔ اختلاف وزیر آغا کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اس سے نیا نکتہ اور نیا سوال جنم لیتا ہے۔ تاہم ان کا اختلاف ذاتی مقاصد اور مادی مفادات کی کوکھ سے کبھی جنم نہیں لیتا تھا اور اگر کبھی ایسا خطرناک مرحلہ آ جاتا تو وزیر آغا صرف احترام آدم کو فوقیت دیتے اور صورت واقعہ پر زمانے کی گرد ڈال کر خاموش ہو جاتے۔ میں نے بارہا ایسے لوگوں کو ان کی مجلس میں مقام امتیاز پر بیٹھا ہوا دیکھا جنہوں نے اخبارات و رسائل میں ان کی مخالفت، حسد اور نفرت کے جذبے سے کی، دشنام طرازی اور کردار شکنی کے مظاہرے پر بھی اترے لیکن جب کسی ادبی محفل میں وزیر آغا سے سرسری سی ملاقات ہوئی انہوں نے تو بیچ عظیم انسانوں کی طرح اس سے اعتراف گناہ اور احساس جرم دلانے کی ضرورت محسوس نہ کی اور اپنے دشنام طراز کو گلے سے لگا لیا۔ میں اسے ان کے کردار کی عظمت قرار نہیں دیتا۔ انسانیت کا احترام تو ان کی عادت تھی اور یہ عادت ان کے خون میں رچی بسی ہوئی تھی۔ چونکہ اس عادت کا انہیں علم نہیں تھا اس لیے اس کی نمائش بھی نہیں کرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے درمیان شخصی اختلاف کی وسیع خلیج حائل تھی۔ میں نے وزیر آغا کو احمد ندیم قاسمی سے خط کتابت کرتے، او مجلس ترقی ادب میں اکٹھے کام کرتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ رشتہ قاسمی صاحب کی وفات تک قائم رہا اور وہ ان کے جنازے کی نماز میں بھی شریک ہوئے تھے۔ پھر ذاتی اختلاف کہاں تھا؟ اور اس کی نوعیت کیا تھی؟

وزیر آغا تحقیقی دنیا میں باقاعدہ طور پر اپنی اولیں تحقیقی کتاب ''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' سے متعارف ہوئے۔ اس سے قبل ان کی نظمیں ساقی، ہمایوں اور ادبی دنیا جیسے رسائل میں شائع ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ اور ان میں سے چند ایک کو حلقہ ارباب ذوق کے سلسلہ ''بہترین نظمیں'' میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ وزیر آغا کی ادب میں اولیں نمود ان کے موجودہ معروف نام سے نہیں ہوئی۔ ان کے اولیں تنقیدی مضامین نصیر آغا کے قلمی نام سے ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوئے اور مولانا صلاح الدین احمد نے ادارتی صفحے پر ان کی تعریف و تحسین کچھ اس والہانہ انداز میں کی کہ وزیر آغا کا ہمزاد

''نصیر آغا'' تھوڑے سے عرصے میں ہی اردو ادب کی معروف شخصیات میں شمار ہونے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد جب ''ادبی دنیا'' کا دورِ پنجم شروع ہوا تو وزیر آغا اس اہم ادبی پرچے کے شریکِ مدیر مقرر ہوئے اور مولانا صلاح الدین احمد کے سانحۂ ارتحال تک اس کے ساتھ وابستہ رہے۔ اس تمام عرصے میں انہیں صدہا ادیبوں سے ملنے اور ان کی تخلیقات سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ ''اوراق'' جاری ہوا تو یہ درحقیقت ''ادبی دنیا'' کے سلسلے کی ہی ایک کڑی تھا۔ میں ''اوراق'' کو اردو کا مثالی جریدہ شمار نہیں کرتا کہ اس سے تعریفِ بے جا کا پہلو نکلتا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ''اوراق'' نے تجدد کی جو قندیل روشن کی تھی اس کی تنویر دور دور تک پہنچی۔ اور تھوڑے سے عرصے میں ہی اسے ''ادبی دنیا'' جیسی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ ''اوراق'' کا حلقہ اثر پاکستان اور ہندوستان میں ہی موجود نہیں تھا بلکہ یہ روشنی ہر اس جگہ پہنچی جہاں اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ دور افتادہ مقامات سے تخلیقات موصول ہوتیں اور ان کے گمنام تخلیق کاروں میں وزیر آغا کو صلاحیت کا شائبہ نظر آتا تو وزیر آغا کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا اور وہ مسرت کی ایک بے پایاں کیفیت سے مغلوب ہو کر اس گمنام فنکار کی نئی تخلیق شام دوستاں آباد کرنے والے رفیقوں کو دکھاتے۔ پھر اس ادیب کو ''اوراق'' کے ایوان میں مناسب جگہ پر مسند آرا کر دیتے اور زندگی کے کسی مرحلے پر بھی اسے احساس کمتری سے دوچار نہ کرتے کہ اسے سب سے پہلے ''ادبی دنیا'' یا ''اوراق'' نے متعارف کرایا تھا۔ آپ اسے شاید وزیر آغا کی بڑائی تصور کریں لیکن مجھے تو یہ بھی ان کی عادت نظر آئی جو انہوں نے مولانا صلاح الدین احمد کے فیضِ صحبت سے حاصل کی تھی۔

وزیر آغا کی اوّلیں ادبی تربیت مولانا صلاح الدین احمد نے کی تھی۔ مولانا کے نزدیک ادب ایک عبادت تھی جو اپنا ثمر آپ ہے اور نمود و نمائش سے بے نیاز ہوتی ہے۔ انہوں نے عمر بھر ادب لکھا۔ کئی لوگوں کی کتابیں شائع کیں، اور ان گنت ادیبوں کو روشناس کرایا۔ اُردو ادب کی کہکشاں آراستہ کرنے میں ان کا حصہ نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ درحقیقت وہ ادیب کو پیش کرنے کی بجائے ادیب کو دریافت کرنے کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ وزیر آغا بھی، مولانا صلاح الدین احمد کے انداز میں روشنی کی اس کرن کو جو ادیب کی اوّلیں تخلیق کے بطون میں کہیں موجود ہوتی ہے، تلاش کرتے اور پھر اس کرن کو قطبی ستارہ بنانے میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔ مقصد یہ کہ روشنی دور دور تک پہنچے اور گم کردہ لوگ روشنی کی اس راہ پر آسانی سے سفر کر سکیں۔ نیا لکھنے والا جب اپنے پروں سے اڑنے لگتا اور شہرت عطا کرنے کے کسی اور مرکز

سے وابستہ ہو جاتا تو وزیر آغا پر مسرت کی ایک اور کیفیت گزر جاتی۔ اس موقع پر وہ اکثر خوشی کا اظہار کرتے کہ نئی ناؤ ادب کھلے سمندروں میں سفر کر رہی ہے۔ میں نے ایسے صد ہا خطوط وزیر آغا کے نام پڑھے ہیں جن میں لکھنے والے وزیر آغا پر اعتماد کرتے اور اظہار ممنونیت کھل کر اور بے کم و کاست کرتے ہیں۔ بلاشبہ وزیر آغا کا ادب اکثر و بیشتر نظریاتی اختلاف کی زد میں رہتا ہے اور اختلاف کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جنہیں وزیر آغا نے بال و پر اور قوت پرواز عطا کی تھی لیکن ان کے کسی دوست کو اس اظہار کی ضرورت نہیں پڑی کہ انہیں ملتے وقت ندامت سے اپنا سر نگوں کر لے۔ وزیر آغا ایسے لوگوں پر زیادہ التفات نچھاور کرتے تھے اور اپنی ملائم طبعی سے ان کے آئینہ دل کا زنگ اُتار ڈالتے تھے۔ اس کھردرے تجربے کے بعد جب لوگ ان کی طرف دوبارہ آتے، تو پھر واپس نہیں جاتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ کے لیے وزیر آغا کی شامِ دوستاں کا جزو بن جاتے تھے۔

زندگی کے ابتدائی مرحلے پر وزیر آغا کی تہذیبی تربیت ان کے والد گرامی آغا وسعت علی خان نے کی، بڑے آغا صاحب گھوڑوں کے سوداگر تھے اور اسی تجارت میں برصغیر کے کونے کونے میں گھوم چکے تھے۔ سوامی رام تیرتھ سے ملاقات کے بعد ان کا رخ حیات تبدیل ہو گیا۔ اور اب ان کا بہت سا وقت اپنے آپ کو تلاش کرنے میں صرف ہونے لگا۔ بہت سے لوگ آج بھی د، ع، خ کو اپنے زمانے کا آتم گیانی تسلیم کرتے ہیں اور ان کے ارشادات سے زندگی کا زنگ اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے گرد اسرار کا دھندلکا سا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے انہیں جب دیکھا تو زندگی کے تقریباً اسی برس گزار کر اپنی مسند وزیر آغا کو سونپ چکے تھے۔ د، ع، خ نے اپنی زندگی میں ہزاروں جوار بھاٹوں کا سامنا کیا تھا لیکن ان کے چہرے پر نوزائیدہ بچوں جیسی معصومیت اور مسکراہٹ تھی۔ ایک سکون جو بے پایاں تھا۔ ایک شانتی جس کا کوئی انت نہیں تھا۔ میں نے انہیں دیکھا تو میرا دل ایک لمحے کے لیے اپنی دھڑکن بھول گیا اور ان کا سحر و جمال مجھے اپنی رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر وہ باتیں کرنے لگے تو خاک و افلاک کے جملہ رازہائے سربستہ نہایت سادہ انداز میں کھلتے چلے گئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"پیارے!

ایک کہانی سن!

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔

موجوں نے کہرام مچایا ہوا تھا۔ دریا کا سر پر خواہشات کی آماجگاہ تھا۔ وہ بے قرار تھا۔ اس کے ہر دے کا طوفان جوالا مکھی کی طرح پھٹ کر باہر آ گیا تھا۔

اس دریا کے کنارے ایک ویدانتی اور یوگی اکٹھے ہوئے۔ دونوں کو دریا پار کرنا تھا۔ اتفاق سے وہاں کشتی آ گئی۔ ویدانتی نے کشتی والے کی ہتھیلی پر دو پیسے رکھ دیے اور کہا

''مجھے دریا پار اتار دے۔''

مگر یوگی نے اس کی اس حرکت کو طنزیہ تبسم کا ہدف بنایا اور ویدانتی کو حقارت سے دیکھا۔

ویدانتی کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر گیا۔

مگر یوگی نے ساری عمر ریاضت کی تھی۔ وہ پانی پر چلنے لگا اور دریا پار کر گیا۔

دریا کے دوسرے کنارے پر ویدانتی اور یوگی کا، ایک بار پھر ایک دوسرے کے ساتھ سامنا ہوا۔ مگر اب ویدانتی کے ہونٹ تبسم میں بھیگے ہوئے تھے، اس نے یوگی سے برملا کہا۔

''پیارے! تو نے اپنا سارا جیون ضائع کر کے دو پیسے کا کام سیکھا ہے۔''

اب میں اس اسرار سے پردہ ہٹانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا کہ ہمارے ملک میں کون کون سے شعرا نے ساری زندگی ضائع کر کے صرف دو پیسے کا کام سیکھا ہے اور عمر بھر قافیہ پیمائی کی ہے۔ تاہم مجھے یہ بات ضرور عرض کرنی ہے کہ د، ع، خ نے اپنے اپدیش میں اصل اہمیت تو جیون کو دی لیکن صرف دو پیسے کا کام سیکھنے سے منع کیا۔ اس سے قبل وہ یہی مشورہ وزیر آغا کو بھی دے چکے تھے اور اس مشورے کی فیض رسانی شمس آغا پر بھی ہوئی تھی۔ لیکن ان دونوں پر اس اپدیش کا اثر مختلف انداز میں ہوا۔ میں اس کا تذکرہ حذف کر کے پہلے ایک واقعاتی پس منظر بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

روایت ہے کہ وزیر آغا کے والد گرامی د، ع، خ اپنے گاؤں میں برگد کے ایک گمبھیر درخت

کے نیچے صبح سویرے کھاٹ بچھا کر گاؤ تکیے کے سہارے دراز ہو جاتے۔ وزیر آغا اور شمس آغا کہ جوانی کی سرحد میں داخل ہو رہے تھے ان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ بڑے آغا صاحب فلسفہ اور تصوف کا درس دینے لگتے۔ اس کا ایک ایک لفظ ان نوجوانوں کے دل میں اترنے لگتا اور روح پر پڑی ہوئی کثافت دھلنے لگتی۔ اس زمانے میں ان دونوں نوجوانوں پر بوڑھا گوتم بدھ بڑی تیزی سے شب خون مار رہا تھا۔ پھر وہ رات آ گئی جب شمس آغا نے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے مکان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ کمبل اوڑھا۔ جوتے پہنے اور سپیدہ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی مایا کی زنجیروں کو کاٹنے کے لیے گھر سے روانہ ہو گیا۔ شمس آغا کا اس دن کے بعد پتہ نہیں چلا۔ وزیر آغا کی زندگی میں تیاگ کا یہ لمحہ تو کبھی نہیں آیا لیکن اس لمحے نے ان پر ایک اور جہانِ معنی ضرور آشکار کر دیا اور وہ دشتِ گم گشتہ کو پانے، جنگل کو لوٹنے، اور اپنی ذات کے غار حرا میں سمٹ کر نئی زندگیوں کو دریافت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ وزیر آغا کی شاعری، انشائیہ اور تنقید اسی بطنِ ماہی کا سفر ہے اور انہوں نے اس سفر کے حوالے سے ہی ان ادبی جواہر پاروں کی تلاش کی ہے جن سے اردو ادب کبھی پہلے شاید آشنا نہیں ہوا۔

وزیر آغا کی روح پر گوتم کا شاید سایہ تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ گوتم بدھ کے مقلد تھے، وہ زندگی کو متاع گرانمایہ سمجھتے اور اسے دو پیسے کے کام میں ضائع کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ وجہ یہ کہ جب وہ غربت کے طویل دور سے گزرے تو تیاگ کا فلسفہ ان کی نظر میں اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ البتہ زندگی جب ان پر مہربان ہوئی تو مایا سے بھاگنے کی بجائے انہوں نے اس کا خیر مقدم خندہ روئی سے کیا۔ اور پھر اسے ریزہ ریزہ تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ دنیا میں ہر لولا لنگڑا بھکاری مایا جمع تو کر سکتا ہے لیکن اسے تقسیم کرنے کے لیے ایک خاص مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ وزیر آغا کو یہ مزاج قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا اور اس میں دوغ، رخ کی تربیت کا عمل دخل بھی شامل تھا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اس مزاج کی تشکیل میں ابتدائی غربت، اور گوتم کے فلسفہ تیاگ کے ردِ عمل کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ وزیر آغا کو زمین سے جو گہری وابستگی تھی، اس سے ان کے ہاں وہ فلسفۂ حیات مرتب ہوا جس کے مطابق یہ زندگی اور اس کی ہر کروٹ ایک بیش بہا عطیہ ہے اور اس کے لذائذ و اثمار سے منہ موڑنا پرلے درجے کی احسان فراموشی۔ چنانچہ وزیر آغا نے دولت کا ذخیرہ کر کے دنیا سے اغماض کبھی نہیں برتا۔

وزیر آغا کے گوتم سے اختلاف کے اور بھی کئی پہلو ہیں۔ گوتم نے شہر سے ویرانے کی طرف

مراجعت کی تھی۔ وزیر آغا گاؤں سے نقل مکانی کر کے پہلے سرگودھا آئے اور پھر لاہور کی طرف سدھار گئے۔ گوتم اپنے محلات کی پر تصنع زندگی سے اکتا گیا تھا۔ وزیر آغا نے شہر کو ایک نسبتاً خاموش کونے میں مکان بنا کر پہلے اسے بے تکلف ماحول سے آشنا کیا۔ پھر وہ شہر کے ہنگاموں کو کھینچ کر اپنے قریب لے آئے۔ ایک وقت تھا جب سرگودھا کے ریلوے سٹیشن پر جانے کے لیے وزیر آغا کے گھر کے بائیں جانب چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ اب ان کا مکان تلاش کرنے کے لیے ''شمع سینما'' کا حوالہ دینا ضروری ہوتا ہے، جو ان کے مکان کے بالکل سامنے بن گیا ہے۔ گوتم بیوی کی پیشانی پر آخری بوسہ ثبت کر کے اور بیٹے کے سر پر آخری بار ہاتھ پھیر کر چپکے چوری ان کی دنیا سے نکل گیا تھا۔ وزیر آغا ہر صبح اپنی ''پاسبان عقل'' کو اوپر کی منزل پر سلام کر کے نیچے آ جاتے اور دوستوں کے لیے ہر نصف گھنٹے کے بعد چائے کا آرڈر بھجوا کر انہیں اپنی موجودگی کا یقین دلاتے رہتے تھے۔ ان کی بیگم دنیا سے اُٹھ گئیں تو ڈاکٹر وزیر آغا پہلے جیسے وزیر آغا نظر نہیں آئے اور آخر ستمبر 2010ء میں اپنا رختِ حیات بھی سمیٹ لیا۔

وزیر آغا کسی زمانے میں صوبائی سطح پر گورنر کی زراعتی کمیٹی کے رکن رہ چکے تھے۔ پھر انہیں مرکزی حکومت کی ایک مشاورتی کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ دو پیسے کے عوض جیون ضائع کر دینے والے کسی مایا کے لوبھی کو یہ ''اعزاز'' مل جاتا تو وہ شاید عمر بھر انہیں بیساکھیوں پر سفر کرتا رہتا۔ لیکن وزیر آغا کے سفرِ حیات میں ادب کے علاوہ دوسری تمام سرگرمیوں کو ثانوی حیثیت حاصل تھی اور وہ اس بات کا بھی ذکر نہیں کرتے تھے کہ ان کے ملنے والوں میں کتنے امیر، سفیر اور وزیر ہیں۔ اور کبھی انہیں وزیروں کی محفل میں یا سرکاری اداروں میں بڑے افسروں کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ اپنے لیے برابر کی سطح پیدا کیے بغیر بات کا رُخ دوسری طرف کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔

ایک دفعہ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میرے شہر کے تین وکیل جو وزیر آغا کے دوستوں میں سے تھے ناگہانی طور پر وزارت کی مسند تک جا پہنچے۔ میرے جیسے دنیا داروں کو خوشی ہوئی کہ اب وزیر آغا کی وساطت سے بہت سے کام نکلیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ پہلے مرحلے پر ہی ان وزرا سے وزیر آغا کا رابطہ ختم ہو گیا اور کوئی وزیر کبھی بھولے سے ان کی شام دوستاں میں آ جاتا تو اس محفل میں گویا مردنی چھا جاتی اور پھر بیک آن یہ محفلِ احتساب بن جاتی۔ ایک سوال وزیر آغا اُٹھاتے، دوسرے سے غلام جیلانی اصغر حملہ کر دیتے۔ ایک مسئلہ سجاد نقوی اُبھارتے۔ دوسرے کو پرویز بزمی شہہ دیتے۔ درمیان میں عزت مآب

سرکاری وزیر لپیٹے دکھائی دیتے تو منظر دیدنی ہوتا۔ اور جسے مشکلات کا حل سمجھا جاتا تھا اس کے لیے نئی مشکل سے نکلنا کٹھن ہو جاتا۔ چنانچہ وزیر آغا نے ان وزیروں سے اپنا یا اپنے کسی دوست کا کوئی ذاتی کام نہیں کروایا۔ کتنے افسوس کا مقام ہے؟

میرا مشاہدہ تھا کہ وزیر آغا سفارش کے ذریعے کسی دنیادار شخص کا کوئی کام کروا نہیں سکتے تھے۔ بلکہ وہ اسے یوگی بننے کی بجائے دیدانتی بننے کا مشورہ دیتے۔ جو لوگ انہیں ایک سفارش کار کے روپ میں دیکھتے تھے اور اپنے دل میں بے جا توقعات کا پہاڑ کھڑا کر لیتے تھے، میں نے ان سے گزارش کی کہ اس غلط فہمی کو جتنی جلدی دل سے نکال دیں گے ان کی صحت کے لیے اتنا ہی مفید ہوگا۔ وجہ یہ کہ وزیر آغا کی روح پر گوتم بدھ نے جو شب خون مارا تھا، اس نے ان کی دنیاداری کی تمام صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔ اگر کوئی دوست مطلب برآری کے لیے انہیں مجبور کر کے کسی بڑے افسر کے پاس لے بھی جاتا تو وہ بات اس مدھم انداز میں کرتے ہیں کہ نہ حرف سوال ابھرتا اور نہ ہی حاکم سرکار کی انا کو تسکین ملتی، بلکہ ذرا سا موقع ملتے ہی وزیر آغا اس محفل میں بھی ادب کا سوال اپنے مخصوص انداز میں اُٹھا دیتے اور افسر مجاز کے دل میں یہ احساس بیدار ہو جاتا کہ اس نے سارا جیون ضائع کر کے صرف دو پیسے کا کام سیکھا تھا اور پھر وہ سوچنے لگتا کہ ادب کی یہ خود مختار سلطنت بھی اس کے زیر نگیں کیوں نہیں؟ عرض کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ سفارش کے ذریعے مقصد کشائی وزیر آغا کے تخلیقی مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ منفعت پسند دوستوں، ادیبوں اور شاعروں کو ڈاکٹر وزیر آغا نے خاصہ مایوس کیا اور اس معاملے میں جب بھی انہیں زمانے کی ''سیدھی راہ'' دکھانے کی کوشش کی جاتی وہ مسکرانے کی بجائے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔ میں عرض کرتا ہوں۔ کیوں؟

وزیر آغا سیدھی اور ہموار راہ پر چلنے کے بجائے پگڈنڈی پر چلتے تھے۔ وہ دوسروں کا بتایا ہوا راستہ قبول کرنے کی بجائے نشیب و فراز سے گزرتے اور اپنی راہ خود تراشتے تھے۔ چنانچہ مجھے یہ بات ہمیشہ کھٹکتی کہ وہ فوری مقبولیت حاصل کرنے کے مجرب نسخوں پر عمل نہیں کرتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ مایوس نوجوان کے اندر زندگی کی لہر دوڑانے کے لیے مجرب اور قوی لطیفے کبھی نہیں سناتے تھے۔ ٹیلی وژن اور ریڈیو کے پروگرام حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ نہ کرتے۔ مشاعروں میں بالعموم شریک نہ ہوتے، کبھی شریک ہوتے تو معاوضہ وصول نہ کرتے اور برے شعر پر داد نہ دیتے۔ معدے کے پرانے

مریض تھے۔ اس لیے تنگ و تاریک گلیوں کے غلیظ ہوٹلوں کے کونے میں بیٹھ کر نہ چائے پیتے اور نہ سموسے کھاتے۔ اپنے کپڑے غسل خانے میں تبدیل کرتے اور غسل خانے میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے چٹخنی چڑھا لیتے تھے۔ وہ اوراق کے نئے لکھنے والوں سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اور پرانے لکھنے والے اگر معیاری چیز عطا نہ کرتے تو غیر معیاری چیز چھاپنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ بہت سے ترقی پسند شعرا کو ان سے یہی شکایت تھی کہ وزیر آغا انہیں "اوراق" میں پروموٹ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی میں یہ لوگ ان کے خلاف محاذ میں صف آرا رہے اور عناد کے پودے کو اپنے خون جگر سے پروان چڑھاتے رہے۔ سڑک پر جاتے ہوئے کوئی انتہائی خوبصورت چہرہ اچانک سامنے آ جاتا تو آنکھیں جھکا لیتے "انشاء اللہ" تو دور کی بات ہے وزیر آغا "ماشاء اللہ" بھی نہیں کہتے تھے۔ انہوں نے اپنی سالگرہ کا جشن کبھی برپا نہیں کیا، اپنے ساتھ شامیں منانے کی دعوت بھی کبھی قبول نہیں کی، ادبی محفلوں میں ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی تھی کہ ان سے ادب کے بارے میں سوالات کیے جائیں اور جو کوئی انہیں "خامۂ خاصانِ عالی" بنانے کی کوشش کرتا تو ان پر جان کنی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں سوچتا ہوں۔

خدا نے وزیر آغا کو کس مٹی سے بنایا تھا؟

مفکّر ادیب وزیر آغا

7 ستمبر 2010ء کے آخری لمحوں میں برِصغیر پاک و ہند کی بساطِ ادب سے وہ رفیع الشان شخصیت اُٹھ گئی جس نے شعور سنبھالنے کے بعد اپنی زندگی معاصر ادب کی مختلف جہات کو اپنی فکر و دانش اور جدتِ طبع سے سنوارنے اور ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچانے میں صرف کر دی تھی۔ یہ ڈاکٹر وزیر آغا تھے جنہوں نے برِصغیر پاک و ہند کے بہت سے لکھنے والوں کے باطن سے ان کی حقیقی تخلیقی جہت دریافت کی، اس جہت کی فکری اور فنی آبیاری کی اور انہیں ادب میں اپنا منفرد نام بنانے کا موقع اپنے جلیل القدر رسالہ ''اوراق'' میں دیا جو 1966ء میں مولانا صلاح الدین احمد مدیر رسالہ ''ادبی دنیا'' لاہور کی وفات کے بعد جاری ہوا تھا۔ وزیر آغا ''ادبی دنیا'' کے دورِ پنجم میں مولانا کے شریک مدیر تھے۔ ان کا بچپن اپنے والد آغا وسعت علی خان (جو تصوف، اور ویدانت کی دنیا میں ''د، ع، خ'' کے نام سے معروف تھے) کے سایۂ عطوفت میں گزرا تھا اور جوان ہوئے تو انہوں نے ان کے ایدلیش سے گراں قدر استفادہ کیا، جس میں معروضی حقیقت کو صوفی کی نظر سے دیکھنے اور ہر شے کو اپنے وجود کا حصہ بنانے کا زاویہ موجود تھا۔ د، ع، خ نے وزیر آغا پر واضح کیا:

> ''صوفی کا کام فقط یہ ہے کہ وہ تمہاری آنکھوں کا رخ تبدیل کر دے۔ ایسا کرنے کے لیے آنکھوں کے سامنے آئینہ لانے کی ضرورت ہے۔ تب آنکھیں خود دیکھنے لگیں گی ...... روحانی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ مادی اعتبار سے بھی۔ پوری زندگی پورا موجود (Existane) ایک ہے۔ اس میں دوئی کا

ہونا محض فریب نظر ہے۔''

وزیر آغا نے گورنمنٹ کالج لاہور سے اقتصادیات میں ایم اے کیا تھا۔ کالج کے زمانے میں انگریزی شعرا کا مطالعہ کیا تو ان کے باطن میں بھی شاعری کا شوق پیدا ہو گیا اور وہ آزاد نظم کہنے لگے تھے۔ لیکن د،ع، خ کی تعلیمات نے، جو اپنشدوں کے بھی قائل تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ'' کائنات اور اس کے اسرار کو سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کا مطالعہ بہت ضروری ہے''، ان کی کایا پلٹ دی تھی، ان کے اپدیش نے وزیر آغا کے تصورات کائنات وحیات کو پاش پاش کر دیا لیکن یہ اپدیش ہی ایک بلند تر سطح پر ایک نئے تصور کی تشکیل کا باعث بھی بن گیا جو روحانی نوعیت کا تھا۔ اس دور میں اپنے افسانہ نگار بھانجے شمس آغا (مصنف ''اندھیرے کے جگنو'') کے ساتھ مولانا صلاح الدین احمد سے ان کی ملاقات ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی اور ان کی باتیں د،ع، خ کے اپدیش کی معنوی تعبیر بن گئیں۔ مولانا نے فرمایا:

''انسان اپنے بدن کی قید میں ہے اور بدن انسان کو اپنے قوانین کے مطابق استعمال کرتا ہے اور انسان اگر لحظہ بھر کے لیے اپنے بدن سے باہر آ کر اس کی کارکردگی کا جائزہ لے تو اسے سکونِ قلب کے قیمتی لمحات ارزاں ہو سکتے ہیں۔''

اس دور میں وزیر آغا تشکیک اور تجسس کی منزل عبور کر رہے تھے، صداقت کے جویا تھے اور بالعموم سامنے کے منظر کے باطن میں اترنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد ان کی نفسی کیفیت کو پہچان کر ان کے سامنے کوئی نیا نکتہ ابھار دیتے۔ ایک دفعہ جب وزیر آغا نے انہیں بتایا کہ وہ کائنات اصغر (Micro cosom) اور کائناتِ اکبر (Macro cosom) کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح ڈول رہے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ڈولنے کا ایک مستقل عالم میرا نوشتہ تقدیر بن چکا ہے تو مولانا نے فرمایا:

''کبھی کائنات اصغر میں سمٹ جانا اور کبھی کائنات اکبر میں تبدیل ہو جانا تو بڑی مبارک بات ہے۔'' ان کے خیال میں ۔'' تشویش ناک بات ٹھہرنا یا منجمد ہونا یا کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گھومتے چلے جانا ہے۔''

انہوں نے کہا:

''جب آدمی تغیر کی زد میں آ جائے، ذہنی طور پر فعال ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں متجسس ہوں تو ایسی صورت میں پوری کائنات اس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح آ جاتی ہے۔ پھر وہ چاہے تو ساری زندگی اس کتاب کا مطالعہ کرتا رہے اور لحظہ بھر کے لیے بوریت یا ذہنی کشمکش کا شکار نہ ہو۔''

مولانا صلاح الدین احمد نے ہی مادے سے آزاد ہونے کے لیے ادب کی تخلیقی اور فنی دنیا میں داخل ہونے کا مشورہ وزیر آغا کو دیا تھا، انہیں نفسیات اور دیگر علوم نو کے مطالعے کی طرف راغب کیا اور ان سے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھوائے جو نصیر آغا کے قلمی نام سے ''ادبی دنیا'' میں ''شباب، تسلسل اور خودکشی''، ''قانون اور اس کا پس منظر'' اور ''لذت اور صوفیانہ تصورات'' کے عنوانات سے شائع ہوئے۔ آخر الذکر مضمون بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا کہ اس میں سوامی رام تیرتھ کی بعض دبی ہوئی خواہشات کو بھی نشان زد کیا گیا تھا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے مضمون ''میری پسندیدہ نظمیں'' اور ''بہار کی ایک شام'' سے ہوا۔ اوّل الذکر میں اس دور کے چند جدید شعرا کی نظموں کے ساتھ فیض کی نظم ''تنہائی'' کا بطور خاص ذکر کیا گیا تھا اور موخر الذکر مضمون میں ایک خیال انگیز داخلی کیفیت موجود تھی جو اسے انشائیہ کے مدار میں داخل کرتی تھی۔ اس دور میں انہوں نے رسالہ ''ساقی'' دہلی میں جو نظمیں ''نصرت آرا نصرت'' کے نام سے لکھی تھیں، ان میں سے ایک نظم ''دھرتی کی آواز'' حلقہ ارباب ذوق لاہور کے نظموں کے سالانہ انتخاب 1946ء میں جگہ پا گئی اور اس کے ساتھ وزیر آغا نے نصیر آغا اور نصرت آرا نصرت کو رخصت کر دیا اور اپنے حقیقی نام سے تخلیقات اور تنقیدی مضامین پیش کرنے لگے۔ اس دور میں ان کی سماجی حیثیت میں بہت اضافہ ہوا اور وہ مغربی پاکستان کے گورنر کی مشاورتی کونسل کے رکن نامزد کیے گئے لیکن یہ چنداں اہم نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ان کے اعماق سے وہ مفکر ادیب بیدار ہو گیا جو سماجی فرائض کے بار گراں کو ترک کیے بغیر کائنات کی ہر کروٹ کو محسوس کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ میں ''دھرتی'' کا ایک گونگا، بہرا یا بے حس وجود نہیں ہوں۔ میں اپنی ذات کو ''دھرتی'' کی ہمہ گیریت سے بچانے پر قادر بھی ہوں''۔ اس دور میں نسوانی محبت میں مبتلا ہونا بھی ان کی زندگی کی ایک زمینی حقیقت ہے، جو شادی پر منتج ہوئی لیکن اس کا

فلسفیانہ زاویہ ایک مضمون میں ظاہر ہوا جس کو عنوان ''مسرت کا تدریجی ارتقا'' تھا اور پھر مسرّت کی ماہیت پر مسلسل سوچنے اور پڑھنے کا نتیجہ ایک کتاب کی صورت میں سامنے آیا جس کا نام ''مسرّت کی تلاش'' تھا۔ اس کتاب کی تحقیق کے دوران ہی وزیر آغا کو احساس ہوا کہ انہوں نے ایک لڑکی سے نہیں بلکہ اس کرہ ارض سے بیاہ رچالیا تھا اور کاشتکاری ان کا پیشہ بن گیا تھا۔ دھرتی سے ان کا رشتہ رزق حاصل کرے گا بھی تھا لیکن یہ دھرتی ان کے جذبات کا حصہ بھی بن گئی تھی اور وہ وقت بھی آ گیا جب انہیں یوں لگتا جیسے ''میں ہی دھرتی ہوں اور آسمان کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں'' یہ احساس جو 1949ء کے لگ بھگ پیدا ہوا ان کی پوری زندگی پر محیط نظر آتا ہے۔ اور ان کی شاعری کی کتابوں ''شام اور سائے''، ''دن کا زرد پہاڑ''، ''گھاس میں تتلیاں''، ''آدھی صدی کے بعد''، ''یہ آواز کیا ہے؟''، ''اک کتھا انوکھی''، ''عجب اِک مسکراہٹ''، ''ہم آنکھیں ہیں''، ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ''، ''دیکھ دھنک پھیل گئی''، ''چٹکی بھر روشنی''، ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' اور ''کائنہ شام'' کی متعدد نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وزیر آغا کی مسرّت دکھوں کو منہا کر دینے سے وجود میں نہیں آتی بلکہ یہ ایک دھڑکتی ہوئی مجسّم کیفیت تھی، زندگی کے لاتعداد دکھوں میں خود بخود اچانک نمودار ہو جاتی اور وزیر آغا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ انہوں نے مسرّت سے معانقہ اپنی پہلی کتاب چھپنے پر بھی کیا تھا اور پھر اس وقت بھی مسرّت ان سے ہم آغوش ہوئی تھی جب انہوں نے صبح کے سکوت میں ایک ننھے سے قہقہے کی آواز سنی۔ انہیں محسوس ہوا جیسے مندر میں گھنٹی بج اٹھی ہو۔ یہ ان کی بٹی مینا (وقار النساء) کی پہلی ہنسی تھی۔ جس نے یہ حقیقت تو آشکار کر دی کہ ''تبسّم زیرِ لب سے لے کر خندۂ دنداں نما تک'' سب نموئے مسرّت کا باعث ہیں لیکن ان کے سامنے ایک بڑا سوال یہ آ کھڑا ہوا کہ ''خود ہنسی کیا ہے؟'' اس سوال کے جواب کی تلاش میں انہوں نے ارسطو، ہابز، کانٹ، ایسٹ مین، برگساں، اور آرتھر کوسلر جیسے مصنفین کا مطالعہ کیا اور نئی کتاب ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' لکھی جس پر رشید احمد صدیقی نے پنجاب یونیورسٹی میں لکھا کہ اس مقالے پر طالب علم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی جائے۔ اس کتاب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہنسی کے محرکات کا تجزیہ کیا گیا اور مزاح کے اماثل کا مزاج دریافت کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس تحقیق کے دوران ہی وزیر آغا کو اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم چیزوں سے مسرّت کشید کرنے پر مائل کیا اور اس رویے نے ان ''خیال پاروں'' کی تخلیق میں معاونت کی جنہیں بعد میں ''انشائیہ'' موسوم کیا گیا تھا۔ وزیر آغا کی انشائیہ نگاری بنیادی طور پر اشیاء، مظاہر

اور مناظر سے لطف اندوز ہونے کا ہی عمل ہے۔

رسالہ ''ادبی دنیا'' کے مدیر معاون کی حیثیت میں وزیر آغا کا ایک منفرد ادبی کام'' سلسلہ مثال'' کے مضامین ہیں جن میں کسی شاعر کے تخلیقی اثاثے سے اس کی انفرادی جہت تنقیدی اور تجزیاتی عمل سے متعین کی جاتی تھی۔ اس زاویے سے وزیر آغا نے میراجی، ن،م، راشد، اختر الایمان، فیض احمد فیض، قیوم نظر، یوسف ظفر، راجہ مہدی علی خان، مجید امجد اور چند دوسرے شعرا پر''ادبی دنیا'' میں مضامین لکھے۔ ان میں سے ''میراجی۔ دھرتی پوجا کی ایک مثال'' کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں شاعر میراجی کو دھرتی کے حوالے سے ثقافتی تناظر میں دیکھنے اور اس کی شاعری کے اجزا اور محرکات کا تجزیہ کرنے کی کاوش کی گئی تھی۔ اس مقالے نے انہیں اصناف شعر میں سے گیت، نظم اور غزل کا مزاج دریافت کرنے پر مائل کیا اور اس کے ساتھ ''ثنویت'' کا تصور بھی پروان چڑھا۔ جس کی امتزاجی صورت ان کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' میں ظاہر ہوئی۔ وزیر آغا کا بنیادی موقف یہ تھا:

> ''کسی زبان کی شاعری کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ پہلے اس تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے جس میں زبان اور اس کی شاعری نے جنم لیا ہے۔ لیکن یہ پس منظر سادہ ورق کی طرح ایک ہموار سطح کو پیش نہیں کرتا۔ یہ دو مختلف سطحوں کے امتزاج سے متشکل ہوتا ہے...... اس کی پہلی سطح دھرتی کی تاریخ کا ایک آئینہ ہے۔ دوسری سطح داخلی اور تہذیبی تصادم کو اُجاگر کرتی ہے۔ ان دونوں سطحوں کے امتزاج سے کسی ملک کا وہ ثقافتی اور تہذیبی پس منظر مرتب ہوتا ہے جو اس کی زبان اور شاعری پر اپنے گہرے اثرت رقم کرتا ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو شاعری کی تین اہم اصناف گیت، غزل اور نظم کو دھرتی کے مزاج سے منسلک کیا اور ثنویت کے تصور کو بروئے کار لائے تو پاکستان میں اس پر شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ترقی پسند رسالہ ''فنون'' میں ان پر دراوڑئیت پھیلانے کا الزام لگایا گیا اور یہ بھی لکھا گیا کہ وزیر آغا دراوڑئیت کو کیا پھیلائیں گے، خود ہی ختم ہو جائیں گے'' لیکن کچھ عرصے کے بعد فضا میں تبدیلی آگئی اور سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد'' جیسے گیت قومی سطح پر قبول کر لیے گئے۔ اور'' اردو

شاعری کا مزاج'' کے خلاف جو منفی ردعمل پیدا ہوا تھا وہ بھی مدہم پڑ گیا۔ تاہم اس ردعمل نے وزیر آغا کی سوچ کو مثبت کروٹ دی اور اب وہ اردو شاعری کے مزاج سے ابھرنے والے تخلیقی عمل پر غور و فکر کرنے لگے، جس کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ زندگی کے جملہ مظاہر بلکہ پوری کائنات میں تخلیقی عمل کا پیٹرن (Pattern) ایک ہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے حیاتیات، اسطور، تاریخ اور ادب کی سطح پر تخلیقی عمل کی کارفرمائی کا جائزہ لے کر اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں انہیں امرت منتھن کی کہانی نے بطور خاص متاثر کیا اور انہوں نے لکھا:

''جب وشنو کے کہنے پر منذیر پر سے بت کو اٹھا کر دودھ کے سمندر میں رکھا گیا اور اس کے گرد واسکی ناگ کو لپیٹ کر اُسر اور دیوتا اسے باری باری کھینچتے رہے، یعنی دودھ کو بلوتے رہے تو اس کے نتیجے میں پہلے لکشمی نے درشن دیا جو حسن اور خوش بختی کی دیوی تھی، پھر دھن دنتری نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں امرت کا پیالہ تھا، جسے پی کر دیوتا دوبارہ شکتی مان کہلائے۔''

وزیر آغا نے مزید لکھا:

''اس کہانی کے مطابق تخلیق کا عمل جاتی میں دودھ بلونے کے عمل کے مشابہ ہے، بلونے کے اس عمل میں مخالف قوتیں مل جل کر حصہ لیتی ہیں پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب دودھ کی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ نہ دودھ رہتا ہے' نہ دہی' مگر اس کے بعد انتشار کے اس عالم سے مکھن اچانک سطح پر آ جاتا ہے جو اساطیر کے مطابق ''امروسیا'' کا دوسرا نام ہے۔''

وزیر آغا نے اپنی کتاب ''تخلیقی عمل'' میں حیاتیات کے نظریہ تقلیب (Mutation) سے استفادہ کیا تو یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ تخلیق ''سبب'' اور ''مسبب'' کے تابع نہیں بلکہ ایک جست سے وجود میں آتی ہے اور یہ جست اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ دو مخالف قوتیں آپس میں ٹکرا کر بے ہیئت ہو جاتی ہیں۔ اور اس بے ہیئتی میں سے تخلیق جست لگا کر باہر آ جاتی ہے۔ انہوں نے قطرے کے سمندر میں جذب ہو کر خود سمندر بن جانے کے مرحلے کو تخلیق قرار نہیں دیا بلکہ لکھا کہ

''تخلیقی عمل میں تو واپس آنا ضروری ہے۔ ورنہ تخلیق وجود میں ہی نہ آ سکے گی۔''

انہوں نے وضاحت کی کہ فنکار ''حسنِ لازوال کے لمس سے تو آشنا ہوتا ہے مگر
اس میں جذب نہیں ہوتا اور نہ ہی ایک مستقل عالم حیرت میں مبتلا ہوتا ہے۔
اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی یہ سعی ہی اسے تخلیق کار کے منصب پر فائز کرتی ہے
۔''

وزیر آغا نے اس نظریے کا عملی اطلاق اپنی کتاب ''تصوراتِ عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں''
کیا تو اقبال کی انفرادیت یہ قرار دی کہ وہ ''بے خودی'' کے عالم میں بھی ''خودی'' کو برقرار رکھنے پر زور
دیتا ہے۔'' وزیر آغا نے اقبال کے اس قول کو کہ ''رسول اکرمؐ نے معراج کے موقعہ پر نورِ ازل کے روبرو
کھڑے ہو کر اپنے وجود کو برقرار رکھا'' تخلیقی عمل کا عطر قرار دیا کیوں کہ بقول ان کے ''یہ وحدت وجودی
مسلک کے متوازی ایک ایسے مسلک کو پیش کر رہا ہے جس کے مطابق ''غرق نور'' ہونے کی بجائے
''اکتسابِ نور'' کرنا زیادہ نتیجہ خیز عمل ہے۔''

میں نے یہ چند باتیں وزیر آغا کی یک موضوعی کتابوں سے حاصل کی ہیں۔ ''تخلیقی عمل'' کی
تھیوری وضع کرنے کے بعد ان کی سوچ فکر کی نظر کے نئے زاویے اختراع کر رہی تھی۔ وہ ''جوہر اور وجود''
اور ''آشوبِ آگہی'' کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے تو ''ساختیات اور رد ساختیات'' کو بھی اہمیت
دے رکھی تھی۔ اور وہ ''امتزاجی تنقید'' کو مقبول بنانے میں بھی پیش پیش تھے لیکن زندگی نے مہلت نہ دی اور
وہ 7 ستمبر 2010ء کی شب کو اگلا دن طلوع ہونے سے قبل اس دنیا سے اٹھ گئے۔

افسوس! اے وائے افسوس!

وزیر آغا —— موت کا شناسا

7 ستمبر 2010ء کا دن اردو ادب کے لیے بالعموم اور میرے لیے بالخصوص ایک سفاک دن تھا کہ وہ دن نصف شب کو رخصت ہوتے ہوتے اس جہان سے ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی اٹھا لے گیا اور کارپردازانِ قضاوقدر کی دائمی یرغمال میں دے کر اہلِ ادب کو یہ پیغام دے گیا:

''اب اُسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر''

اور کیفیت یہ تھی کہ اب 'چراغِ رخِ زیبا'' دستیاب بھی ہو جاتا تو ہم آغا صاحب کو ڈھونڈ کر نہ لا سکتے کہ فرشتۂ اجل انہیں لے کر ملکِ عدم کو روانہ ہو گیا تھا۔ ان کی وفات سے وہ چراغ بجھ گیا تھا جس کی فکری روشنیوں نے گزشتہ نصف صدی کے اردو ادب کو تابندہ رکھا تھا۔

وزیر آغا اردو زبان کی ان چند ممتاز شخصیات میں سے تھے جن کے افکار کی روشنی ماضی کو منور اور حال کو روشن کرتی ہے اور اس روشنی کی لکیریں مستقبل کی طرف سفر کرتی ہیں تو یہ توقع ہوتی ہے کہ آنے والی نسلیں ان سے گراں قدر استفادہ کرتی رہیں گی۔ اب وہ اس دنیا سے اٹھ گئے ہیں تو افقِ ادب پر دُور دُور تک اندھیرا نظر آتا ہے۔ لیکن میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہ موت کی تخریب کاری سے غافل نہیں تھے اور موت کو ایک ایسا معاہدہ قرار دیتے تھے جو انسان نے پیدا ہوتے وقت ہی زندگی کے ساتھ قائم کر لیا تھا۔ اور اس آگہی کی پرچھائیاں ان کی شاعری میں از ابتدا تا اختتام پھیلتی چلی گئیں تھیں۔ ان کی شاعری کی پہلی کتاب '' شام اور سائے'' میں ایک نظم کا عنوان ۔۔۔ ''حیاتِ نو'' ہے لیکن اس کا آغاز ہی موت کے شعور سے ہوتا ہے۔

نقرئی سکوں میں ڈھلتے ہوئے یہ شام و سحر
ایک بے نور اداسی کی گپھا میں چپ چاپ
نرم بوندوں کی طرح گرتے چلے جاتے ہیں

(نظم "حیات نو" 1954ء)

اب نظم "پرانی بات" پڑھتا ہوں تو مجھے اس نظم میں شام کے جھٹپٹے میں وزیر آغا کے آہنی عزم کی آواز سنائی دیتی اور نرم لچکیلی شاخوں والا "پیڑ" زندگی کا استعارہ محسوس ہوتا ہے جسے شاعر اپنا دائمی مسکن بنانے کے لیے آمادہ نہیں:

مجھے دور جانا ہے، میں جا رہا ہوں
میں پنچھی نہیں ہوں کہ اک پل کے سکھ کے لیے
تیری پھولوں بھری نرم آغوش کو اپنا مسکن بنا ڈالوں
زمانے کو تیری بھری بزم کے کسمسانے
بڑی زور سے، چیخ کر پھڑ پھڑانے کا منظر دکھاؤں
مجھے دور جانا ہے اور میں جارہا ہوں

(نظم۔ "پرانی بات" 1956ء)

میں نے نصیر احمد ناصر کے رسالہ "تسطیر" کے جولائی تا ستمبر 2010ء کے شمارے میں بھی آغا صاحب کی نظموں میں موت کی دو پرچھائیاں دیکھیں جو اگلے ہی چند دنوں میں زندگی کو مستور کرنے والی تھیں۔ایک نظم "غنودگی" کی چند سطور حسب ذیل ہیں:

غنودگی کو اوڑھ کر وہ سو گئے
تو خواب پھڑ پھڑا کے جاگنے لگے
غنودگی کا سائباں چھایا ہوا تھا چار سو
مگر وہ خواب بھی عجیب تھے

کہ سائبان تار تار کر گئے
عجیب گول ہیئتوں میں ڈھل گئے
زمین سے اڑے، آسماں کی سمت
دُور دُور تک گئے
کہاں گئے پتا نہیں
وہ خواب تھے
وہ آسمان کا رزق تھے چلے گئے

میں نے وزیر آغا کو لاہور میں حالتِ حیات میں غنودگی کے عالم میں بھی دیکھا تھا اور پھر ان کے گاؤں وزیر کوٹ میں لکڑی کے تابوت میں سفید کفن میں دائم استراحت میں بھی دیکھا، تو ''سرگوشی نے لب'' کھول دیے۔

آخر اِک دن
گھر اپنے تم لوٹے
اور پھر لوہے کے بستر کے اوپر
صدیوں پرانی تھکن میں لپٹے
کانچ کے ایک تعویذ کی صورت
آن گرے
اور آنکھوں کے سوچ پردوں کے
گرنے سے پہلے ہی
مشتِ خاک ہوئے

(نظم۔ ''سرگوشی سے پہلے'' ۔2010ء)

ان کی ایک نظم میں تو وہ پورا منظر بھی موجود ہے جب ان کے عزیز واقربا اور دوستوں کے وسیع حلقے نے انہیں لحد میں اتار کر اور قبر پر پھولوں کی چادر ڈال کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے تھے۔ وزیر آغا آغوشِ مرگ سے دیکھ رہے تھے اور نفسِ مطمئنہ سے کہہ رہے تھے۔

بنی سنوری صداؤں نے

بھی بھتی ہوئی میری کہانی کو

ہزاروں رمرزوں کا طن داؤدی عطا کر کے

گہرے پانیوں کے پار کی دنیا کو

جانے کے لیے رخصت کیا ہے

(نظم "ہمارے مہا اسطور کے اندر" 2010ء)

موت کے اس شعور نے ان کی 89 برس کی شعوری زندگی کے پورے عمل میں کبھی یاس وقنوطیت پیدا نہیں کی۔ بلکہ وہ زندگی کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ جان کر اسے رجائیت کی نظر سے دیکھتے اور اس کے ایک ایک لمحے کو غنیمت سمجھتے تھے۔ ان کے والد گرامی آغا وسعت علی خان (د، ع، خ) جو تصوف اور ویدانت میں گہری دلچسپی لیتے تھے، انہیں فرمایا کرتے تھے:

"جس طرح خواب کا ناظر (Subject) بھی تو ہے اور منظور (Object) بھی، بالکل اسی طرح جاگرت کے سپنے میں بھی ناظر اور منظور کی تقسیم بے معنی ہے۔ یہی تیرا کام ہے کہ تو ناظر اور منظور کی تقسیم کو بھول جائے۔"

اور واقعہ یہ ہے کہ وزیر آغا نے اس تقسیم کو ہمیشہ بھلائے رکھا۔ وہ زندگی کے ناظر بھی تھے اور منظور بھی اور اس تناظر میں انہوں نے موت کی حقیقت کو بھی شامل رکھا۔ انہیں بچپن میں ایک مرتبہ محرقہ تپ کا عارضہ ہوا اور اس نے انہیں معدے کے مستقل آزار میں مبتلا کر دیا اور یہ روگ آخری دنوں میں نہ صرف پریشان کن صورت اختیار کر گیا بلکہ کئی اور عارضوں کے آغاز کا باعث بھی بن گیا۔ انہوں نے اپریل 2004ء میں اپنی بیگم صفیہ آغا کی وفات (جو کینسر کے جاں کاہ حملے سے فوت ہوئی تھی) کا صدمہ بڑے حوصلے اور صبر سے برداشت کیا لیکن یہ صدمہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے باطن میں سرطان کی طرح اپنی جڑیں پھیلاتا چلا گیا۔ اور وہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اگست 2010ء کے تیسرے ہفتے میں ڈاکٹر انور محمود خالد کی معیت میں ان کے مطالعے کے کمرے میں پہنچا تو پلنگ پر پڑی ہوئی کتابوں میں وہ ایک کتاب ہی نظر آئے۔ لیکن پھر اس کتاب میں حرکت پیدا ہوئی، وہ اٹھے اور ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو "زندگی" کو اہم موضوع کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے

اس گفتگو کے دوران میں ہمیں وہ اقتباس بھی پڑھ کر سنایا جو رفیق سندیلوی نے ان کے ایک خط سے جو 7 فروری 1993ء کو لکھا گیا تھا، اپنی کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا شخصیت اور فن'' میں اقتباس کیا تھا۔ اس اقتباس میں وزیر آغا زندگی کو موت کے ساتھ جڑا ہوا دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں:

''بات یہ ہے کہ پیدائش کے ساتھ موت بھی جنم لیتی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ایک دائرہ جنم لیتا ہے جس کے مرکز میں ایک نقطہ ہوتا ہے۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے یہ نقطہ بڑا ہوتا جاتا ہے تا آنکہ ایک روز یہ پورے دائرے پر محیط ہو جاتا ہے۔ بالکل چاند گرہن کی طرح، اس فرق کے ساتھ کہ چاند کو باہر سے گرہن لگتا ہے جب کہ موت کو اندر سے۔ موت کا ادراک مجھے شروع ہی سے ہے اور میری نظموں کے تمام ادوار میں موت ایک مجسم حقیقت کی طرح ہمہ وقت میری نظروں کے سامنے رہی ہے۔ کبھی میں اس سے خوفزدہ ہوا ہوں۔ کبھی اس سے مصافحہ کیا ہے۔ کبھی اس پر پیار آیا ہے مگر ستر برس کے سنگِ میل کو عبور کرنے کے بعد موت کو معروضی زاویے سے دیکھ رہا ہوں۔ اسے ایک فطری عمل گردانتا ہوں۔''

اس فطری عمل کی تکمیل 7 ستمبر 2010ء کو رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہوئی تو وہ آکسیجن ٹینٹ میں تھے۔ قلم قرطاس منگوا کر اپنی بیٹی مینا کے لیے یہ لکھا:

''بیٹی! اب تم گھر جاؤ میں بھی سونے لگا ہوں'' اور صرف پانچ منٹ کے بعد وزیر آغا ابدی نیند سو گئے۔

''خاموش ہو گیا وہ چمن بولتا ہوا''

افسوس! اے وائے افسوس!

جدید نظم کی اہم ترین آواز

وزیر آغا کے ساتھ میری پہلی باقاعدہ طویل ملاقات 1964ء میں ہوئی تھی۔ 14 سال کے عرصے میں انہیں میں نے نظم کے تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے بھی دیکھا اور پھر اپنی ہی نظم کے نقاد کی صورت میں بھی ان کی باتیں ان کی زبان سے سنیں۔ وہ اس زمانے میں جدید نظم کے نمائندہ شاعر کے طور پر معروف ہو چکے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے نصرت آرا نصرت کے نام سے "ساقی" (دہلی) میں نظمیں لکھیں لیکن جب ان کی نظم "دھرتی کی آواز" حلقہ ارباب ذوق کے سالانہ انتخاب میں شامل ہوئی تو وہ اپنے اصلی نام سے لکھنے لگے۔ ضمنی طور پر شاید یہ لکھنا بھی مناسب ہو کہ وزیر آغا نے نثری مضامین کے لیے بھی ایک فرضی نام (نصیر آغا) منتخب کر رکھا تھا۔ "ادبی دنیا" میں ان کے ابتدائی مضامین اور انشائیہ نما تحریریں نصیر آغا ہی کے نام سے چھپتی رہیں۔ میرا خیال ہے جس زمانے میں انہوں نے نصرت آرا نصرت کو اپنے تخلیقی وجود سے الگ کیا تو انہی دنوں نصیر آغا کو بھی رخصت کر دیا اور بعد میں "سلسلۂ مسرت" کے مضامین وزیر آغا کے نام سے شائع ہونے لگے۔

وزیر آغا سے پہلی ملاقات ہوئی تو ان کی نظموں کی کتاب "شام اور سائے" زیر ترتیب تھی، جس کے لیے وہ کڑا انتخاب کر رہے تھے۔ شام کی محفل میں ہر نظم پر کڑی بحث ہوتی۔ "کاسۂ شام" ان کی نظموں کی آخری کتاب تھی۔ ان دونوں کتابوں کے دوران میں "دن کا زرد پہاڑ"، "نردبان"، "آدھی صدی کے بعد"، "گھاس میں تتلیاں"، "اک کتھا انوکھی"، "یہ آواز کیا ہے"، "عجب اک مسکراہٹ"، "چنا ہم نے پہاڑی راستہ اور ہم آنکھیں ہیں"، "منظر عام پر آئیں"، ان کی نظموں کے چھ اولیں مجموعے "چہک

اُٹھی لفظوں کی چھاگل'' کے عنوان سے ایک جلد میں پیش ہو چکے ہیں (جس میں اس وقت تک کی غزلیں بھی شامل تھیں، بعد میں ان کی کلیات غزل بھی ''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل'' ہی کے نام سے شائع ہوئی جس میں ان کی تمام غزلیں شامل ہیں جب کہ اسی عنوان کے تحت ان کی کلیات نظم بھی زیر ترتیب ہے۔) میں نے ان سب مجموعوں کو معرضِ تخلیق میں آتے، ان کی نظموں پر تنقید و تبصرہ اور تحسین و آفریں کا طوفان اُٹھتے اور پھر وزیر آغا کو تنقید کے بلند مقام پر فائز ہوتے دیکھنے کے بعد ان کی شاعری کو نظر انداز کر دینے کی منصوبہ بندی کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ ہشتاد سالہ شاعر اور وزیر آغا کو مسترد کر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ زمانے کا بے رحم جاروب کش، خود ان کے کلام کو جو ہزاروں نظموں اور غزلوں اور سینکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا تھا، سمیٹ کر غرقِ دریا کر رہا تھا۔ ان کے چرنوں میں بیٹھنے والے اور ان سے رموزِ شعر سیکھنے والے خود ان کی نفی کر رہے تھے اور اب اپنا پرچم بلند کرنے میں مصروف تھے لیکن وزیر آغا کی شاعری اور ان کا فکر و فن اگلی منزلوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور ''تمنا کا دوسرا قدم'' تلاش کر رہا تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد وزیر آغا کو پاکستان ہی میں نہیں، پورے برِ صغیر میں جہاں اردو نظم کی اہم ترین آوازوں میں شامل کیا گیا۔ ان کے شعری تجربات کے تجزیے کیے گئے، ان کے فنی رموز زیرِ بحث لائے گئے اور ان کے اسلوب میں نہ صرف جدید نظم نگاری کو کروٹ دینے کی سعی کی گئی بلکہ کئی نقادوں نے اعتراف کیا کہ وزیر آغا نے جدید نظم کے شعور کو فروغ دیا ہے اور نوجواں شعر کو روایتی نظم کے جنگل سے نکالنے کی سعی بھی کی ہے۔ یہ خدمت وہ مجلّہ ''اوراق'' کے ذریعے بھی انجام دے رہے تھے اور ان کی یہ خدمت میرا جی کے مماثل تھی جس نے جدید نظم کو رسالہ ''ادبی دنیا'' میں فروغ دیا تھا۔

''شام اور سائے'' کی اشاعت پر عبدالمتین نے لکھا:

> ''ڈاکٹر وزیر آغا اردو کے علامت پسند شعرا کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں مگر وہ اپنے ہم خیال فن کاروں سے اعتدال اور توازن کے اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہیں، وزیر آغا کی نظموں کا مطالعہ، دل میں چلمن سے لگے بیٹھے اس محبوب کا دل آویز تصور ابھارتا ہے جو صاف چھپتا بھی نہیں، سامنے آتا بھی نہیں۔''

میری رائے میں وزیر آغا کی ابتدائی دور کی شاعری کی بلاشبہ ایک اہمیت یہ ہے کہ علامت

نگاری کو نظم کا جزو لاینفک بنانے اور اس کی گہرائیوں میں ایقان رکھنے والے اس شاعر کو ممتاز ترقی پسند شعرا نے بھی داد دی۔ تاہم ان کی نظم نگاری کی صحیح جہت کا ادراک مجید امجد نے کیا:

> ''وزیر آغا کی نظموں کو پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا شعر ایک ایسی علامت ہے جو ایک زندہ استعارے سے اُبھرتی ہے۔ ''شام اور سائے'' کی نظموں میں استعارے کے پھیلاؤ کے ہمراہ موضوع کا دائرہ بھی پھیلتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ موضوع کی حدود۔ استعارے کی سرحدیں بھی متعین کرتی چلی گئی ہیں۔''

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ وزیر آغا اردو نظم کے اس بلند مقام پر اچانک نہیں پہنچ گئے تھے، اس کا عقبی دیار بھی موجود ہے۔ وہ کالج کے زمانے میں ہی شعر گوئی کی طرف راغب ہو گئے تھے لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ شعر کہتے تھے۔ وہ اپنی ذات میں مگن رہنے والے طالب علم تھے اور اپنے اشعار کو اتنا قیمتی سمجھتے تھے کہ ان کی اشاعت بھی انہیں گوارا نہیں تھی۔ ''غزل کلچر'' میں زندگی بسر کرنے کے باوجود ان کا رجحان جدید نظم کی طرف تھا۔ انہیں انگریزی زبان کے متعدد شعرا کا کلام زبانی یاد تھا۔ اس دور میں فیض احمد فیض، میرا جی، ن۔م۔ راشد، مجید امجد، اختر الایمان، یوسف ظفر اور قیوم نظر کا نام نئی نظم کے افق پر روشن ستاروں کی طرح چمک رہا تھا۔ وزیر آغا کو ان شعرا کی نظمیں بھی نہ صرف یاد ہو گئی تھیں بلکہ وہ ان کا موازنہ انگریزی شعرا سے کرتے تو ان پر جدید نظم کے اسرارِ فن اور رموزِ اظہار کھلتے چلے جاتے۔ چنانچہ انہوں نے نظم کو اپنے اظہار کی پسندیدہ صنف قرار دیا اور ''شام اور سائے'' کی اشاعت کے بعد بھی اپنی انفرادیت کا نقش نظم ہی سے قائم کیا۔

اردو نظم کے ریاض کے سلسلے میں وزیر آغا نے ''ادبی دنیا'' میں نظم کے تجزیاتی مطالعے میں گہری دلچسپی لی، جو میرا جی نے ''اس نظم میں'' کے عنوان سے شروع کر رکھا تھا۔ بعد میں جب وہ ''ادبی دنیا'' کے شریک مدیر بنے تو انہوں نے اس سلسلے کو دوبارہ جاری کیا جو ''اوراق'' میں بھی جاری رہا۔ جدید شعرا کے باطن کو ان کی نظموں سے دریافت کرنے کی ایک عمدہ کاوش وزیر آغا نے ''سلسلۂ مثال'' کے مضامین میں کی۔ یہ تجزیاتی مطالعے اتنے مفصل، مکمل اور فکر انگیز تھے کہ ان کے مثبت اثرات وزیر آغا کے مزاج کا جزو بن گئے اور پھر ان سب کے تنوع سے انہوں نے اپنی نظم کا پیکر تشکیل دیا۔ چنانچہ وزیر آغا کی نظم نگاری

،ان کے مکمل فنی ریاض کی آئینہ دار ہے اور اس میں زندگی کے حقیقی تجربات موجود ہیں۔

نظم ''میں اور تو'' کی علامتیں اپنا اسرار فطری انداز میں کھولتی ہیں اور حقیقت کی اس حیرت کو اجاگر کرتی ہیں جو شگفتن گل کی طرح خود بخود بیدار ہو جاتی ہے۔ اس نظم میں مشاہداتی کیفیت بھی ہے اور حسی تجربہ بھی نمایاں نظر آتا ہے لیکن وزیر آغا حواس خمسہ کو فساد خوں سے محسوس کرنے والے شاعر نہیں، وہ تخلیقی لطافت کے لذت آشنا ہیں۔ وہ لذت کوشی کو ترتیب نہیں دیتے، ان کی شاعری میں رنگ روشن نظر آتے ہیں اور خوشبو پرافشاں محسوس ہوتی ہے۔ وہ فطرت کے کالے روپ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کی شاعری میں سیاہ ناخن، لمبے دانت، مڑے تڑے پنجے، چندھیائی آنکھیں اور اس قسم کی متعدد تشبیہیں اور استعارے اُبھرتے ہیں تو ان کا مقصد وہ تماشا دکھانا ہوتا ہے جو کائنات میں فطرت نے چاروں طرف برپا کر رکھا ہے۔ وزیر آغا نے ان منفی رموز سے فطرت کا بھیانک چہرہ دکھانے کی سعی کی ہے، تاہم ہمیشہ ان کا مقصد مثبت ہی رہتا ہے۔ ''ڈھلوان'' اور ''جب آنکھ کھلی میری'' ایسی نظموں میں متذکرہ ہر دو مزاجوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر نظم میں منفی طاقتیں انسان پر غالب نظر آتی ہیں لیکن یہ صرف ایک منظر ہے جس کا تاثر بھیانک ہے جب کہ مؤخر الذکر نظم کا تاثر تمام تر مثبت ہے۔ جب فرد کو پہاڑی کے مماثل قرار دینے کے بعد سمندر کا مثیل بھی بتایا جاتا ہے تو شاعر کا زندگی میں ایقان ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ رویہ دریا کہ سمندر میں گم ہو جانے اور مقام ابد پا لینے کے رویے سے بالکل مختلف ہے۔

وزیر آغا نے ''شام اور سائے'' کی نظمیں عنفوان شباب میں لکھی تھیں۔ اس دور میں وہ ہر روز شمس آغا کی معیت میں اپنے والد گرامی جناب د، ع، خ (آغا وسعت علی خان) کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھتے اور ان کے ''اپدیش'' سے فیض یاب ہوتے تھے۔ میرا خیال ہے وہ علامت نگاری کی طرف حادثاتی یا اکتسابی طور پر نہیں آئے، انہوں نے نظم میں نیم روشن صبح اور دھندلے اجالے میں حقیقت کو پیش کرنے کا انداز اپنے والد گرامی سے سیکھا جو معرفت اور سلوک کی باتیں اس طرح کرتے کہ سامع ان کے ارشادات کی منور دھند سے حقیقت تلاش کر لیتا اور ان کی باتوں کی تفہیم اپنے ذوق و ظرف کے مطابق کرتے ہوئے انہیں ایسے معانی پہناتا جن سے اسے طمانیت قلب محسوس ہونے لگتی۔

وزیر آغا کی بیشتر نظموں میں علامت کے ابہام کے بجائے علامت کا حسن نمایاں نظر آتا ہے جو معنویت کو وسعت دیتا ہے اور اس کی تہہ داری آشکار کرتا ہے۔ ان میں حقیقت، عریاں انداز میں سامنے

نہیں آتی۔تاہم اسے مستور قرار دینا بھی ممکن نہیں۔

وزیر آغا اپنی کئی نظموں میں جبر کی ایک مجسم تصویر پیش کرتے ہیں جو انسان کی بے بسی کو بھی مصور کرتی ہے اور جبر سے آزادی کا احساس بھی دلاتی ہے لیکن جبر کی اس ہمہ گیر فضا میں جب وہ فطرت سے موانست کا موقع تلاش کر لیتے ہیں تو ان کی کیفیت تبدیل ہو جاتی ہے۔سرشاری کی کیفیت ان کی نظم ''سورج کے آنے سے پہلے'' میں رونما ہوتی ہے۔ان کی نظم ''جرس'' میں ''پوروں کے شیو ناچ'' میں رقص کا منظر پیش ہوا ہے لیکن آخر میں جب ''ممتا'' بیدار ہوتی ہے تو دل گداز حیرت جاگ اٹھتی ہے۔

وزیر آغا کی نظموں میں ''دکھ'' کو ایک مثبت کردار کی حیثیت حاصل ہے۔وہ مسرّت کی ماہیت کو پہچانتے ہیں لیکن انہیں یہ بھی احساس ہے کہ مسرّت اور غم ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور مادی انسان کو ان سے مفر نہیں۔ان کے ہاں دکھ مسرت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور اپنی موجودگی سے حیرت زدہ کر دیتا ہے۔مثلاً ان کی نظم ''دکھن خیمے میں رہتی ہے'' میں ''دکھ'' اپنی مجسم صورت میں شاعر کا شریک غم ہو جاتا ہے جب کہ حصولِ مسرّت کی ایک نادر کیفیت ان کی نظم ''تم جو آتے ہو'' سے ظاہر ہوتی ہے جس میں محبوب کی آمد پر زندگی کا تمام کرب دور ہو جاتا ہے اور زمین اور زماں کی گردش کو معطل کر دیتا ہے۔

زمانی اعتبار سے وزیر آغا کی نظم ان کی وفات تک نصف صدی سے زیادہ کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔وہ اردو کے شاید واحد شاعر ہیں جنہوں نے نظم کی داخلی اور خارجی ماہیت کی دریافت اور تفہیم، اردو شاعری کی دو اصناف غزل اور گیت کے علی الرغم نظم کا مزاج دریافت کرنے کے علاوہ اس کی جڑیں تلاش کرنے کے لیے تہذیبی اور ثقافتی عناصر سے استفادہ کیا۔لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو نظم ان کے لیے محض اظہار کا وسیلہ نہیں،اس کے بطون میں ان کا تہذیبی اور فکری سرمایہ ان کا جذبہ خیال اور سب سے اہم جزر و مد حیات بھی سمایا ہوا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کی کتابوں کے بیشتر ''پیش الفاظ'' خود لکھے اور ان میں اپنا نظریہ بیان کرنے کی سعی کی اور جب شاعر کے تخلیقی عمل سے گزر کر وہ قاری کے مقام پر آئے تو انہوں نے اپنی نظموں کا تجزیہ کیا اور خود اپنے اظہار کے بعض زاویے اور نادر گوشے تلاش کیے۔مثال کے طور پر انہوں نے اپنے شعری مجموعہ ''عجب اک مسکراہٹ'' کا پیش لفظ ''دیکھنے کی بات'' لکھا تو اس میں شاعری کی آنکھ کے حوالے سے ایک ایسی کھڑکی کا انکشاف کیا جو باہر کی طرف بھی کھلتی ہے اور اندر کی طرف بھی۔

''یہ کھڑکی جب باہر کی طرف کھلتی ہے تو شاعر کو تغیرات کا عالم اور

مظاہر کی بوقلمونی دکھائی دینے لگتی ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے سامنے شطرنج کی ایک بساط چن دی گئی ہے جس پر مہروں کا کھیل جاری ہے۔ اسے باہر کی یہ دنیا بیک وقت خوبصورت بھی نظر آتی ہے اور داغ دار بھی۔ جب وہ اس کے فطری حسن کو دیکھتا ہے تو کھل اُٹھتا مگر جب اسی دنیا میں حادثات و سانحات اور ظلم اور جبر کے مظاہر دیکھتا ہے تو کڑھنے لگتا ہے۔ دوسری طرف جب آنکھ کی کھڑکی اندر کی جانب کھلے تو وہ اپنے باطن کے اُن تہ در تہ منطقوں کا ناظر بن جاتا ہے جن کے پھیلاؤ اور گہرائی کی کوئی حد نہیں۔ یہ وہ دیار ہے جو پر اسراریت کی دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ وہ شاعر جو محض "باہر" کا ناظر ہے۔ اسے بصارت تو مل جاتی ہے مگر وہ بصیرت سے بالعموم محروم ہی رہتا ہے اور وہ شاعر جو صرف اندر کی طرف دیکھتا ہے اسے بصیرت تو نصیب ہو جاتی ہے مگر اس کے ہاں بصارت فعاّل نہیں ہوتی۔ تاہم جب شاعر ایک ایسے مقام پر آ کھڑا ہو جہاں بصارت اور بصیرت باہم آمیز ہو جائیں تو اس کے ہاں ایک ایسی آگاہی پیدا ہوتی ہے جو کائنات کو ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھنے کے بجائے اسے ایک "نامیاتی کل" کے طور پر دیکھنے پر قادر ہوتی ہے۔ شعری آگاہی شے اور اس کے عکس کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتی اور نہ ایک کو برتر اور دوسرے کو کم تر گردانتی ہے۔ اس کے نزدیک دونوں کے جڑنے ہی سے "کل" تشکیل پاتا ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کی تفہیم ناممکن ہے۔"

یہ اقتباس شاعر کے کردار اور نظم کی تخلیقی جہات کی فلسفیانہ تفہیم کا مظہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وزیر آغا نے اپنی نظموں میں بصارت اور بصیرت کو باہم مدغم کرنے، انہیں آپس میں جوڑنے اور ایک پورے "کل" کی صورت دینے کی سعی ہی نہیں کی، بلکہ انہوں نے اس مقام اتصال پر کھڑے ہو کر گزرتے ہوئے واقعات کی تجدید اور بہتے موسموں کی عبارت پڑھنے کی سعی بھی کی ہے۔ وزیر آغا نے اپنی شاعری کے قریباً ابتدائی بیس برس کے دوران میں مختصر نظمیں لکھیں، پھر قطرے نے قلزم بننے کی تخلیقی ضرورت محسوس کی تو انہوں نے طویل نظم نگاری اختیار کی۔ "نرمینس"، "آدھی صدی کے بعد" اور "اک کتھا انوکھی"

ایسی نظمیں متعدد تخلیقی نشستوں کو مربوط کرنے کی کاوش ہی نہیں، یہ تجربے کے تسلسل کو بھی آشکار کرتی ہیں اور اس تخلیقی عبادت کی مظہر بھی ہیں جو وقفوں سے ادا کی جاتی ہے لیکن جس میں وقفے آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔

''آدھی صدی کے بعد'' کی اہمیت یہ ہے کہ وزیر آغا آنکھ کی کھڑکی سے کبھی باہر کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی اندر کی طرف۔ باہر نیا زمانہ نظر آ رہا ہے اور اندر ''غار کہف'' ہے جس کا سکہ تبدیل نہیں ہوا۔ وزیر آغا نے اس دید اور باز دید سے اپنی احساساتی زندگی مرتب کی ہے جو گھر کی محدود سی فضا سے شروع ہوتی ہے اور پھر پوری کائنات کو محیط کر لیتی ہے۔ اس شعری آپ بیتی میں تجربہ، گرد در گرد لپٹا ہوا ہے، لیکن اب وزیر آغا نے یہ گرہیں خود کھولی ہیں تو ان کے سابقہ متعدد نظموں کے مفاہیم نئے انداز میں اپنا باطن آشکار کر دیتے ہیں اور یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ سچا شاعر اگر حقیقت کو قوسوں کی صورت میں بھی پیش کرے تو وہ اسے دائرہ بنانے اور جزئیات کو کل کی صورت دینے پر قدرت رکھتا ہے اور اپنے باطن کو صورت پذیر کر سکتا ہے۔ تمثیلی اعتبار سے اس نظم کو زندگی کے چار ادوار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ''جھرنا'' ہمکتے ہوئے بچپن کا مظہر ہے۔ ''ندی'' پرشور جوانی کی عکاسی کرتی ہے۔ ''دریا'' اس لمبے سفر کی علامت ہے جب انسان کو اعتمادِ حیات حاصل ہو جاتا ہے اور وہ زرخیزیاں بکھیرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کبھی پرشور ہو کر کناروں کو کاٹتا ہے، کبھی مدھر راگنی سناتے ہوئے زمانے کو روحانی سکون عطا کرتا ہے۔ آخری دور ''سمندر'' سے موسوم ہے اور اب وہ بچوں کی صورت میں خود تقسیم ہو چکا ہے اور ایک بڑے سمندر میں اترنے کو تیار ہے۔ یہ آدھی صدی کی مسافت کا اختتام نہیں، ایک نئے سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ وزیر آغا نے اس مقام پر درویشی کا روپ اختیار کیا ہے:

اور پھر یوں ہوا
میں نے اِک بار پھر
بڑکا بہروپ بدلا
خود اپنے ہی اندر سے باہر نکل کر
وہاں جس جگہ اب سے پہلے
خنک ریت کا ایک صحرا بچھا تھا

میں پتوں کا اک تاج

سر پر سجائے --- کھڑا ہو گیا

پھر میں

اپنے ہی چھتنار کی چھاؤں میں

اور اپنی ہی ریشِ مبارک کے سائے میں

دھرتی کی مسند پہ

تشریف فرما ہوا

آلتی پالتی مار کر

ایسے بیٹھا کہ جیسے ازل سے

یہی میرا مسکن تھا

آنکھوں کو میچے

میں اپنے ہی محور پہ

گردش سی کرنے لگا

اپنے ہونے کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں

خود اپنے ہی منظر کو

تکنے لگا تھا

اختر حسین نے درست لکھا ہے کہ:

وزیر آغا کی یہ نظم ہمکتی ہوئی ساعتوں سے ایک طویل داستان حیات بناتی ہے۔

''نظم میں تخلیقی سطح پر زندگی کی بازیافت کی یہ کاوش، میری رائے میں اردو میں پہلا تجربہ تھا۔ اس نے جو تاثر پیدا کیا شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ حمایت علی شاعر اور شمس الرحمن فاروقی بھی منظوم سوانح حیات لکھنے پر مائل ہوئے اور اب یہ کہنا مناسب ہے کہ متعدد جدید شعرا آئندہ اس تجربے کو وسعت آشنا کریں گے۔''

رشید امجد نے وزیر آغا کو بنیادی طور پر ایک مفکر شاعر قرار دیا ہے لیکن ان کا تفکر اقبالؒ کے تفکر

کے مشابہ نہیں۔انہوں نے فیض کے انداز میں ایک مخصوص نظامِ حیات کی تعمیر اور تشکیل کو شاعری میں فکری صورت بھی نہیں دی، انہوں نے راشد کی طرح مقامی انسان سے عالمی انسان کی رفعت کا ادراک کرنے کی سعی بھی نہیں کی۔اس کے برعکس ان کی فکر کی جولاں گاہ کائنات اور اس کے بوقلموں مظاہر ومناظر ہیں جو پوشیدہ بھی ہیں اور ظاہر بھی۔وزیر آغا نے انہیں بُود کے مقام پر دیکھا اور نبود کے مقام پر تلاش کرنے کی سعی کی۔اس سے ان کی لفظوں میں حیرت جاگتی ہے اور ہر نئے نظارے پر کروٹ بدلتی چلی جاتی ہے۔ چانچہ ان کی شاعری اس متفکرانہ تخیل کی صورت گری ہے جو ''کب، کیوں اور کیسے'' کے ساتھ ''کس نے'' کے بارے میں دریافت کرتی ہے اور وجودی انسان کو ماورائے وجود دیکھنے کی تخلیقی دعوت دیتی ہے۔ان کی نظم نگاری کے اس انداز کو بیرونی دنیا میں بھی قبول کیا گیا اور ان کے تراجم جب دنیا کی متعدد زبانوں میں شائع ہوئے تو انہیں محض اردو کا شاعر تسلیم کرنے کے بجائے عالمی نظم کا شاعر قرار دیا گیا اور اس کی تحسین متعدد یورپی اور امریکی نقادوں نے کی اور یہ تراجم جب نوبیل ایوارڈ کمیٹی (سویڈن) کے سامنے لائے گئے تو وہ نوبیل ایوارڈ کی ''شارٹ لسٹ'' پر تیسرے نمبر پر تھے...... (یہ بات ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے منکشف کی)۔

وزیر آغا نے جدید اردو نظم کو نئی جہت دی ہے۔انہوں نے تشبیہ کی پامال حالت سے بلند ہو کر استعارے اور علامت سے آئینے کا کام لینے اور نقش در نقش تصویریں منعکس کرنے کی سعی کی۔ان کی شاعری میں ان کا تخلیقی وجود نئی لفظیات سے رونما ہوتا ہے اور انوکھا روپ دکھاتا ہے۔سب سے اہم بات یہ کہ انہوں نے بلند آہنگ لہجہ اختیار کرنے کے بجائے زیرلبی اختیار کی جو فطرت کی آواز سے ہم آہنگ ہے۔ بظاہر ان کی شاعری کی عمر نصف صدی سے زیادہ ہو چکی ہے لیکن وہ ان گنت تجربے کرنے کے بعد آخری المیہ تک ''طرح نو'' کی دریافت کی کوشش کرتے رہے۔چنانچہ انہوں نے روایت کو شکستہ کیے بغیر اپنا نیا شعری نظام قائم کیا جسے پرکھنے کے لیے آنکھ کبھی اندر کی طرف اور کبھی باہر کی طرف کھلتی ہے اور پھر اثبات کرتی ہے کہ وزیر آغا خود اپنے مثیل اور آزادی کے بعد کی اردو نظم کی ایک اہم ترین آواز ہیں جس کی صدائے بازگشت عالمی سطح پر بھی سنی جارہی ہے۔اور ان کی تحسین کرنے والوں میں کئی غیر ملکی زبانوں کے وہ شعرا بھی شامل ہیں جو انہیں تراجم کے ذریعے پڑھ چکے ہیں۔

وزیر آغا کی غزل

نظم کی وحدت تخلیق سے، غزل کی ریزہ خیالی کی طرف ڈاکٹر وزیر آغا کی پیش قدمی ان کے تخلیقی سفر کا ایک بے حد اہم اقدام ہے۔ اس اقدام کے پس منظر میں وزیر آغا کا یہ ایقان موجود ہے کہ:

''شاعر کی ذات کئی منزلہ عمارت کی طرح ہے اگر اس کے ہاں
ذوق جستجو اور جذبۂ سیاحت کی معمولی سی رمق بھی موجود ہے تو وہ عمر عزیز اس
عمارت کی محض ایک منزل میں رہ کر بسر کرے گا۔''

اس ضمن میں انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ:

''میں نے اپنی ادبی زندگی کا معتد بہ حصہ نظم کی معیت میں گزارا اور
یہ آج سے چند برس پہلے کا واقعہ ہے کہ میں سنجیدگی سے غزل کی طرف متوجہ ہوا۔
گویا میں نے ایک طویل مدت عمارت کی زیریں منزل میں بسر کی۔''

وزیر آغا کو اس زیریں منزل سے بڑا لگاؤ تھا، اس منزل کی تمام کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں، اس منزل نے انہیں زندگی کے تجربات پر تجزیاتی عمل آزمانے کا موقعہ دیا۔ انبوہ میں تنہائی کا احساس بخشا، یوں وزیر آغا کی انفرادیت کو جلا ملی اور بہت سی ایسی نظمیں سامنے آئیں جن میں زندگی کی طویل مسافتیں اور ان کے پھیلتے ہوئے سائے موجود تھے اور فطرت نے جن جذبوں کو پھولوں کی زنجیر میں باندھ رکھا تھا وہ جذبے بھی ان نظموں میں تخلیقی دل آویزی سے نمایاں ہو گئے تھے۔ وزیر آغا کی نظم نگاری کا یہ مقام آخری نہیں تھا۔ چنانچہ لمبے عرصے تک نچلی منزل میں پناہ لینے کے باوجود انہیں اطمینان کامل حاصل نہیں ہوا اور

ان کے دل میں یہ آرزو مچلنے لگی کہ کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لینے کے لیے عمارت کی بالائی منزل کی یاترا کرنی چاہئے ۔ یہاں پہنچ کر وزیر آغا کو یوں لگا جیسے ساری کائنات ہی تبدیل ہوگئی ہو۔ نظم کی دنیا میں جو انہوں نے کرب تنہا برداشت کیا اور جو خوشیاں اکیلے سمیٹیں اب ان میں پورا زمانہ شریک تھا، تجربے کا اجتماعی زاویہ ان کے سامنے گرہ کشا ہونے لگا تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ تنہا اور الگ تھلگ ہستی نہیں، جیسے وہ اگر ایک فرد ہیں تو سارا معاشرہ ان کے دل میں کلبلا رہا ہے اور اگر وہ بیج ہے تو سارا درخت ان کے اندر سمایا ہوا ہے۔ چنانچہ غزل کی دیار کی سیاحت وزیر آغا کو مرغوب خاطر نظر آئی اور انہوں نے بالائی منزل کی بلندی سے زندگی کو اجتماعی زاویے سے دیکھنے کی سعی کی تو جذبہ و احساس کا ایک نیا پیکر سامنے آیا۔ رنگوں کی ایک نئی جوالا بکھری اور وزیر آغا کی غزل نے ایک نئے اسلوب ترتیب سے ان رنگوں کو بے دریغ سمیٹنا شروع کر دیا۔

بالفاظ دیگر نظم سے غزل کی طرف پیش قدمی میں وزیر آغا کے شوق کی تخلیق کی وہ فراوانی بھی موجود ہے جو داخل کے بے ساختہ ابال سے پیدا ہوتی ہے اور جو شاعر کو الاؤ میں بے خطر کود پڑنے پر مائل کرتی ہے، غزل نگاری کا یہ جذبہ چونکہ صادق تھا اس لیے وزیر آغا نظم کی معطر تنہائی سے نکلے اور چپ کار یگزار عبور کیا تو پھر لفظوں کی دھول سے غزل کے ان گنت پھول نکھارتے چلے گئے۔ اور زیریں منزل پر لوٹ جانے کی آرزو کے باوجود انہوں نے بالائی منزل کو خیر باد نہیں کہا۔ اس زاویے سے دیکھیں تو وزیر آغا کی غزل بظاہر اس سفر کا تخلیقی ثمر ہے جو انہوں نے زیریں منزل سے بالائی منزل تک خوش دلی سے طے کیا ہے۔ تاہم انہوں نے جو ریاض نظم نگاری کے سلسلے میں کیا تھا اس کی بہت سی دل آویز صورتیں ان کی غزل میں بھی سما گئیں۔ انہوں نے انفرادی تجربے اور تجزیاتی عمل کو جب اجتماعی تجربے اور انضمامی پیکر کی صورت دی تو غزل ایک نئے تخلیقی لمس سے آشنا ہوئی اور یوں غزل کی ایک ایسی صورت سامنے آئی جس پر وزیر آغا کی انفرادیت کی مہر لگی ہوئی تھی اور جسے سراہنے اور قبول کرنے میں زمانے نے ذرا بھر تاخیر نہیں کی۔

واضح رہے کہ وزیر آغا کی غزل کی طرف پیش قدمی محض اضطراری نوعیت کی نہیں بلکہ اس کے پس پشت برسوں کا تفکر بھی شامل ہے۔ اور یہ تمام عرصہ انہوں نے غزل کے مزاج کو سمجھنے اور اس کے انفرادی فنی زاویے متعین کرنے میں صرف کیا۔ اردو ادب کے ایک اہم نقاد کی حیثیت میں انہوں نے جب ''نظم جدید کی کروٹیں'' کا ابتدائیہ لکھا اور اس میں ''نظم اور اس کا پس منظر'' پیش کیا تو بالواسطہ طور پر غزل کی ماہیت بھی ان کے زیر غور آئی۔ انہیں احساس ہوا کہ غزل خالصتاً مشرق کی پیداوار ہے اور اسے زیادہ

فروغ ان مشرقی ممالک میں ملا جہاں زمین کی وسعت آسمان کی وسعت سے ہم کنار ہے۔ سر بفلک پہاڑ اور حد نظر تک پھیلے ہوئے صحرا ہیں۔ زرخیز میدان اور گھنے جنگل ہیں، اشیائے خوردنی کی فراوانی فطرت کی فراخ دلی کا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس ماحول میں فکری طور پر فرد نے حقیقت کے ادراک کا استخراجی عمل اختیار کیا اور تخلیقی سمت میں غزل کو فروغ دیا۔ جس میں تجربہ اجتماعی اور عمومی صورت میں سارے معاشرے کی ترجمانی کرتا ہے اور پورے دور کی کروٹوں اور ذہنی تحریکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور وہ بھی اس انداز میں کہ اس سے زمان و مکان کی حدود ظاہر نہیں ہونے پاتیں۔ چنانچہ ماضی کے تجربے میں مستقبل کی بازگشت موجود ہوتی ہے اور حال دونوں زمانوں کو ایک تخلیقی تجربے سے آپس میں مربوط کر دیتا ہے۔

وزیر آغا نے مجموعی طور پر نظم کو فرد اور اس کے باطن کی کہانی قرار دیا ہے جب کہ غزل بلند ٹیلے پر سے دیکھتے چلے جانے کا زاویہ ہے۔ وزیر آغا نے غزل کی ماہیت کے اس ابتدائی خاکے کو ''اردو شاعری کا مزاج'' میں زیادہ تفصیل اور استدلال سے پیش کیا ہے اور اس کے مزاج کے داخلی اور خارجی زاویوں کو نادرہ کاری سے دریافت کیا ہے۔ غزل ماں اور بچے کے مختصر سے ربط باہم کا اظہار کرتی ہے اور غزل کی ریزہ کاریت اس حقیقت کی خود یوں غمازی کرتی ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک ایسا جزو ہے، جو غزل کے ''کل'' کا حصہ ہونے کے باوجود اس سے جدا بھی ہے اور ہر شعر ایک الگ حیثیت کا حامل ہونے کے باوصف غزل کے سلکِ گوہریں سے منسلک بھی ہے۔ بعینہ جیسے بچہ اپنی انفرادیت کے باوجود اپنی ماں سے بھی وابستہ ہے، غزل کے مزاج کے اس اجمال سے مقصود یہ عرض کرنا نہیں ہے کہ غزل کے فن اور مزاج کے بارے میں وزیر آغا کے نظریات کیا ہیں بلکہ مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ غزل کہنے سے پہلے وزیر آغا نے غزل کی داخلی ماہیت کا تجزیہ کیا۔ مشرق میں اس کے فروغ کے اسباب دریافت کیے، غزل کے پیکر نے مختلف ادوار میں جو ارتقائی تبدیلیاں قبول کی تھیں ان کا مطالعہ کیا اور جب محسوس کیا کہ ان کے بعض جذبے اور احساسات نظم کی اکائی میں سمانے کے بجائے غزل کی عمودی صورت میں بہتر طور پر ڈھل سکتے ہیں تو وہ بے اختیار مشاہدے کی زیریں منزل سے بالائی منزل کی طرف چلے گئے۔ اس منزل میں زمین کا پھیلاؤ آسمان کی وسعت سے ہمکنار تھا اور ان کا ذہن اس کارواں کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا جو بار با تجربوں کی صورت میں زمین کی سطح پر رواں دواں تھا اور جس پر اب وزیر آغا بالائی منزل سے نظر ڈال رہے تھے۔

وزیر آغا کی غزل میں جذبہ بلاشبہ بیضوی صورت اختیار کر لیتا ہے، اس کے کھردرے کنارے جھڑ جاتے ہیں، اس میں وہ دردمندی بھی موجود ہے جو غزل کے داخلی مزاج کا جزولاینفک ہے۔ وزیر آغا نے اس آگہی کو جو انہیں نظم کے طویل تخلیقی سفر میں متعدد بکھری ہوئی اکائیوں کی صورت میں ملی تھی غزل میں اجتماعی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ لفظ کے باطن سے اپنے ذاتی تجربے کی لرزتی ڈولتی کرن کو بیدار کرنے کے فن جانتے تھے، وہ لفظ کے جسم میں خیال کی روح کو کچھ اس طرح شامل کر دیتے کہ جذبہ خود بخود لو دینے لگتا اور قاری اس برقی رو کو بھی محسوس کرنے لگتا جو غزل کے داخل سے بے اختیار اس کی جانب لپکتی چلی آ رہی تھی۔ اس سب کے باوصف اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وزیر آغا نے غزل کو جس آگہی سے آشنا کیا ہے وہ بنیادی طور پر نظم کی تخلیق نگاری سے ہی ماخوذ ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ہاں ابلاغ مستقیم اور بالراست نہیں بلکہ بالواسطہ اور علامتی ہے۔ وہ لفظ کی سطح کے ساتھ چپکے ہوئے معانی کو کچھ زیادہ درخور اعتنا نہیں سمجھتے بلکہ معنی کی اصلی پرت کو سطح کے نیچے چھپا دیتے ہیں، ان کے جذبے کی تمام تر ترسیل علامت کی زبان میں ہوئی ہے، الفاظ موڑ کاٹ کر اپنے معانی قاری پر کھولتے ہیں اور اس پر ایک اور جہان معنی آشکار کر دیتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وزیر آغا نے علامت کو مجرد اکائی کی صورت میں پیش نہیں کیا۔ علامت کی مجرد صورت فلم میں نسبتاً زیادہ کامیابی سے استعمال کی جا سکتی ہے۔ وزیر آغا نے اردو غزل میں ایک مخصوص علامتی فضا خلق کی ہے، ان کی غزل پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس ظاہر جہان کے پس منظر میں ایک اور جہان بھی پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ایک منظر کے بطن سے ایک بالکل جداگانہ منظر طلوع ہوتا ہے۔ ایک تصویر پورے لینڈ سکیپ کو متحرک اور متشکل صورت میں پیش کرتی ہے لیکن جب اس کے عقب میں جھانکیں تو تصویر ایک نئے تناظر میں سامنے آ جاتی ہے۔ یہ کیفیت اخفایابعد کی نہیں بلکہ اس سے غزل کا حسن اور اس کی ایمائیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وزیر آغا نے حقیقت کے پر اسرار بھیدوں کو گرہ میں باندھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے ایک سچے تخلیق کار کی حیثیت میں غزل میں دریافت کے اس عمل کو آزمایا ہے جس کے تحت شاعر دو موجود اشیا کے درمیان ایک نیا ربط باہم پیدا کر دیتا ہے۔ اور قاری کو اس نئی دریافت پر جمالیاتی مسرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پس غزل میں وزیر آغا کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے غزل کی عمودی فضا کو علامت کی خوش رنگ طلسمی فضا میں مبدل کرنے کی سعی کی اور قاری کو

تجربے کا مستقیم عرفان فراہم کرنے کے بجائے اسے تخلیق مکرر سے گزرنے کی دعوت دی۔ وزیر آغا کی غزل کا یہ منفرد وعلامتی انداز مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پر میں تھا

نکلے تری تلاش میں ہم کچی برف پر
پٹری کے ساتھ بنتے گئے پاؤں کے نشان

شاید کہ تو نے کھول دی مٹھی بھری ہوئی
طشتِ فلک میں نقرئی سکّے بکھر گئے

ہر لمحہ جیسے اوک لبالب بھری ہوئی
اور دل تمام عمر یوں ہی بے خبر رہے

میلوں تک تھی تجلسی ہوئی دوپہر کی قاش
سینے میں بند سینکڑوں صدیوں کی پیاس تھی

چاندنی گر پڑی درختوں پر
جاں بلب آخری دعا کی طرح

پھر ایک دن ہوا نے کہا "میں تو تھک گئی"
خوشبو کا بوجھ میری کمر کو جھکا گیا

کہتے ہو تم کہ خود میں سمٹنے لگی ہے شام
بھیگے پروں کے ساتھ جھپٹنے لگی ہے شام

وزیر آغا کے ہاں کائنات کی کوئی چیز بھی بے جان نہیں ،ایک تخلیق کار کی حیثیت میں انہوں نے ہر چیز کو ذی روح تصور کیا ہے اور اس کے گرد جذبات کا ایک خوبصورت حسی دائرہ سا بن دیا ہے۔ چنانچہ ان کی غزل میں شام وہ پرند ہے جو جاں بلب سورج پر بھیگے پروں سے جھپٹتا ہے۔ ہوا وہ دوشیزہ ہے جو اپنی کمر پر خوشبو کا بوجھ اٹھائے قریہ قریہ سفر کر رہی ہے۔ چاندنی دعا کی طرح متحرک ہے اور درختوں پر یوں گرتی ہے جیسے نا مستجاب مناجات بے اختیار ہونٹوں پر لڑھک جاتی ہے۔آسمان انسانی ہاتھ ہے جس کی مٹھی میں ستاروں کے ان گنت نقرئی سکے بھرے ہوئے ہیں اور ستاروں کا کھل اٹھنا گویا مٹھی کے کھل جانے کا عمل ہے۔غزل میں جدیدیت کا یہ انداز بلاشبہ وزیر آغا کی انفرادی عطا ہے لیکن اس بات سے انکار شاید ممکن نہ ہو کہ اس کے پس پشت علامت نگاری کی کامل تفہیم ،استعارے کی تخلیق کا مکمل شعور اور نظم کا طویل ریاض موجود ہے اور اسی نے وزیر آغا کی غزل کو نیا لہجہ اور نیا اسلوب عطا کیا ہے اور وہ غزل کی مظبوط روایت سے ہم رشتہ ہونے کے باوجود اپنی ایک الگ راہ بھی تراشتے ہیں۔

وزیر آغا کے تخلیقی اور تحقیقی عمل میں اس کشادہ فضا کے اثرات بے حد نمایاں ہیں جس کے ایک طرف شفاف ندی رواں دواں ہے ،ندی کے دونوں طرف حد نظر تک پھیلی ہوئی مٹیالی زمین ہے، اس زمین کی شریانوں میں ندی کا پانی اترتا ہے تو اس سے سوندھی سوندھی باس پھوٹتی ہے اور افقی اور عمودی سمتوں میں پھیلتی جاتی ہے۔ایک طرف پہاڑ کا سلسلہ ہے جس کے قرب و جوار میں لکہ ہائے ابر ابر رواں دواں رہتے ہیں۔ یہ پہاڑ صبح کے وقت شنگرفی ،دوپہر کے وقت لاجوردی اور شام کے وقت مٹیالے ہو جاتے ہیں۔ ان کے اوپر آسمان کا بسیط چھتر ہے،آوارہ بادل کبھی برس پڑتے ہیں تو زمین کے بھاگ جگا دیتے ہیں ،نہ برسیں تو دھرتی کی آنکھ میں آنسو چھلک پڑتے ہیں ،وزیر آغا نے اس رنگ بدلتی فضا میں پرورش پائی ہے۔اس نے ان کے ہاں فطرت کے پر اسرار بھید میں شرکت کرنے کا جذبہ بیدار کیا ہے۔ یہ لینڈ سکیپ ان کے سپنوں کا بھنڈار ہے جسے نظم میں اکائی کی صورت اور غزل کے عمومی انداز میں وہ بے دریغ تقسیم کر رہے ہیں۔ وزیر آغا کی غزل میں کھلا آسمان ،دھوپ، ستارے، چاند، جگنو، درخت، پرندے وغیرہ سب کا ایک علامتی روپ ہے اور یہ روپ اسی فضا سے

اکتساب ہوا ہے۔ یہ علامتیں غزل کو نہ صرف ایرانی فضا سے نجات دلاتی ہیں بلکہ جذبے کو اپنے وطن کی ارضی مظاہر سے مس کرنے کا موقعہ بھی عطا کرتی ہیں، چنانچہ وزیر آغا کی غزل سے جو مخصوص باس اُٹھتی ہے اس میں پاکستان کی دھرتی کی خوشبو موجود ہے اور یہ بے نام اور بے عنوان اور بے حد عمومی ہونے کے باوجود اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جن میں زمین کی کاشت سے خرمن کے حاصل تک متعدد زاویے موجود ہیں۔

بادل برس کے کھل گیا رت مہرباں ہوئی
بوڑھی زمین نے تن کے کہا ، میں جواں ہوئی

شبنمیں گھاس ، گھنے پھول، لرزتی خوشبو
کون آیا ہے خزانوں کو لٹانے والا

کس بادل کا دامن تھام کے تیرے دیس سے جاؤں
تیرا قد آکاش سے اُونچا ، لمبی تیری پور

اترا تھا وحشی چڑیوں کا لشکر زمین پر
پھر اک بھی سبز پات نہ سارے نگر میں تھا

جھونکے نے بڑھ کر پیڑ کو چھیڑا تو دفعتہً
اُڑتے ہوئے فضا میں پرندوں کے پر کٹے

بارش ہوئی تو دھل کے سبک اور ہو گئے
آندھی چلی تو ریت کی دیوار ہو گئے

میلوں تک تھی جلسی ہوئی دوپہر کی قاش
سینے میں بند سینکڑوں صدیوں کی پیاس تھی

اَب ڈھول میں اٹے ہوئے رستے پہ ہے سفر
وہ دن گئے کہ قدموں تلے سبز گھاس تھی

چڑیوں کا شور سن کے طبیعت چہک اٹھی
چھینٹا سا اوس کا مجھے بیدار کر گیا

اردو غزل نے آج تک اپنا بیشتر تخلیقی سفر شہر کی فضا میں طے کیا ہے۔ بے شک اس میں گلستانوں ،خیابانوں اور لالہ زاروں کا ذکر بھی موجود ہے لیکن یہ گلستان و خیابان بھی ایسے ہیں جو شہر کے ساتھ لارنس گارڈن کی صورت میں پیوستہ ہیں، وزیر آغا نے غزل کو آزاد اور خود کفیل دیہات اور اس کی مخصوص آگہی سے آشنا کیا ہے تو اس سے دیہات کی مٹی کی نرالی باس بھی اُٹھائی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ دیہات کو فطرت کا بہت زیادہ تحفظ حاصل نہیں۔ دیہات ہمہ وقت تیز ہوا، چلچلاتی دھوپ، بے وقت بارش اور ناگہانی سیلاب کی زد میں رہتا ہے۔ زندگی ہمیشہ خوف کی زد میں آئی رہتی ہے اور حوادث احساس فنا کو ہمہ وقت بیدار رکھتے ہیں۔ وزیر آغا کی غزل میں غم کی داخلی کسک موجود ہے، وہ اس خوف اور احساس فنا کی زائیدہ نظر آتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وزیر آغا کا غم خود ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ اس کا ایک روپ اجتماعی ہے۔ یہ غم اس وقت بیدار ہوتا ہے جب فطرت کا پرامن جمالی چہرہ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور اس کا جلالی روپ منظر پر ابھرتا ہے۔ اس وقت تیز گام حوادث اچانک آباد کھیتوں، لہلہاتے درختوں اور پھولوں سے اٹی ہوئی راہ گزاروں پر حملہ زن ہو جاتا ہے۔ خوف مرگ میں مبتلا پرندے کنڈے جھاڑ کر اپنے آشیانوں سے اڑ جاتے ہیں، اور سرسوں کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ یہ لمحہ وزیر آغا کے لیے قیامت کا لمحہ ہے۔ چنانچہ اب جو غم کی دردیلی لہر اٹھتی ہے وہ اپنے ساتھ وزیر آغا کو بھی بہا کر لے جاتی ہے۔ یہ کیفیت ان کی شاعری میں غم کی افزائش کرتی ہے اور اس کے کائناتی زاویے کو ابھارتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

ستاروں کے جلے کھیتوں میں کون اب
کھلی پلکوں سے موتی چن رہا ہے؟

کبھی کانٹوں پہ موتی بو گئے ہو
کبھی چپ چاپ مٹی ہو گئے ہو

پتے کے زیورات تھے اس شاخسار کے
ایسی چلی ہوا کہ ہوئے رہگزار کے

آندھی کے چابکوں سے ہرے پات جھڑ گئے
جو بچ گئے وہ آپ ہی شاخوں پہ سڑ گئے

اوپر بجھے ستاروں کی بکھری ہوئی تھی راکھ
نیچے گھنے درختوں کا جنگل جلا ہوا

گرد اڑتی ہے تو اٹ جاتے ہیں اشجار تمام
اوس گرتی ہے تو اک حشر بپا ہوتا ہے

دیکھا تو خوں میں لتھڑے پڑے تھے شجر تمام
نیزے گڑے ہوئے تھے ہر اک شاخسار کے

خشک شاخیں کبھی ایسی تو نہیں چیختی تھیں
کون آیا ہے پرندوں کو ڈرانے والا

سوکھی زمین پہ بکھری ہوئی چند کلیاں
یہ تو بتا نگار چمن تجھ کو کیا ہوا

جدھر دیکھتا ہے ہوا روبرو ہے
یہ دل زرد پتے کی صورت کھڑا ہے

ان سب کے باوجود خوش آئند بات یہ ہے کہ وزیر آغا کے ہاں غم جاں کاہ نہیں اور وہ خوف سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ جیسے جیسے حوادث کی یورش بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے ان کے ہاں مدافعت کی قوت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے اور اپنی دھرتی کی زرخیزیاں بڑھانے اور اس سے زیادہ ثمر سمیٹنے کا جذبہ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ وزیر آغا کے ہاں طمانیت اور مسرت کا جو زاویہ ایک اہم قدر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے وہ اس ماحول کی بالواسطہ عطا ہے۔ اور اس کا اظہار ان کی غزل میں متعدد مرتبہ ہوا ہے۔

شام کے کھیتوں میں ننگے پاؤں چلنا چاہیئے
ہر طرف پھولوں کا سونا ہے یہاں بکھرا ہوا

دیکھا جو ریگ زار قمر سے تو میرا گھر
آب رواں پہ بہتا ہوا اک گلاب تھا

پہنچے پس خیال تو دیکھا کہ ریت پر
اک پھول کی طرح تھا وہ خیمہ کھلا ہوا

تم گودے زمین کی اترے تو ہو مگر
کھیلو گے کس کے ساتھ خلا کے غبار میں

دلچسپ بات یہ ہے کہ شہر کے ساتھ ایک مدت سے رابطہ قائم رکھنے کے باوجود وزیر آغا کے ہاں شہر سے محبت کا مظبوط رشتہ استوار نہیں ہوا۔ ان کی غزل میں خاموش، ویران اور خالی مکان کا ذکر متعدد مرتبہ آیا ہے۔ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ اس پر ایک مہیب سناٹا مسلط ہے۔ لیکن وہ ایک انجانے خوف میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزل کا یہ ''مکان'' اس شہر کی علامت ہے جس کی بھری انجمن میں وزیر آغا تنہا ہے، اس تنہائی نے ان کے ہاں جو ردعمل پیدا کیا ہے وہ خاصا تلخ اور بے حد ترش ہے۔

وہ رت جو لوٹ کر آئی تو دیکھا
مکیں غائب ، مکاں خالی پڑا ہے

آنکھیں اداس چہرے کی رنگت اڑی ہوئی
کیا حال میرا صبح کا اخبار کر گیا

زنگ آلود گھر کا سناٹا
اور میں چیختی ہوا کی طرح

کیسے کہوں کہ میں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ ، زمیں بے لباس تھی

خبر اخبار میں، پھر جگ ہنسائی
یہ کیسی موت کوئی مر گیا ہے

چمن میں آ کے عجب اپنے دل کا حال ہوا
نئی رتوں کا تماشا بھی اک وبال ہوا

کھلے کواڑ ہیں، آنکھوں کے اور سناٹا
کبھی تو تم بھی کرو یہ حسیں مکاں آباد

میں خوش کہ مل سکا، تجھے اک اجنبی کی طرح
تو مطمئن کہ میں تجھے پہچانتا نہ تھا

کھلنے لگا تھا شہر کا مینار اور ہم
ایسے ڈرے کے قدموں تلے راستہ نہ تھا

شہر کی فضا وزیر آغا پر گھٹن اور انقباض کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور ان کے ہاں جو سب سے بڑی خواہش بیدار ہوتی ہے وہ اپنی گم شدہ جنت، عقبی دیار اور اور خواب کے شہر کی طرف لوٹ جانے کی خواہش ہے۔

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
ناؤ پلٹ تو آئے مسافر اُتار کے

خواب کے شہر کی طرف لوٹ جانے کی آرزو نے وزیر آغا کے ہاں صرف خواہش سفر ہی پیدا نہیں کی بلکہ ان کی غزل پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ عرصے سے ایک مسلسل اور لامختتم سفر کر رہے ہیں، ان کی شاعری میں ''پرندہ'' استعارۂ سفر ہے۔ دن ڈھل جانے کے بعد بھی اس پرندے کے بدن کا لہو پروں میں سرگرم عمل رہتا ہے اور اسے مائل بہ سفر رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر آغا کے ہاں سفر کسی منزل موعود کی تلاش نہیں بلکہ ذوق حیات ہے اور وہ سفر کو زندگی کے تجربات سمیٹنے، مناظر فطرت کا مشاہدہ کرنے اور کائنات کے اسرار کو منکشف کرنے کے لیے ہی اختیار کرتے ہیں، ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو اس کا تمام عمل ارض وطن کی تین مختلف ٹکڑوں میں طے ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا 57 سول لائنز سرگودھا میں آباد ہے اور یہاں وزیر آغا نے اپنی شام دوستاں آراستہ کر رکھی ہے، دوسرا ٹکڑا لاہور میں

موجود ہے اور یہاں وزیر آغا اپنے ملکی اور غیر ملکی دوستوں سے ملتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی موضوعات پر اور دنیا بھر کے ادب پر باتیں کرتے ہیں۔ ارض وطن کا تیسرا حصہ وزیر آغا کا گاؤں ہے اور اس سے وزیر آغا رزق حیات کشید کرتے ہیں۔ اسی سرزمین پر وزیر آغا جمالِ فطرت سے اپنا براہ راست رابطہ قائم کرتے ہیں، یہ تینوں خطہ ہائے ارض وزیر آغا کی فکری اور تخلیقی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں اور ان تین مقامات کے درمیان وزیر آغا ایک طویل عرصے سے مسلسل سفر کر رہے ہیں۔ یہ سفر وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہے، اس کی سمت جب شام ڈھلے وزیر آغا کے عقبی دیار کی طرف ہو تو اس میں جہد مسلسل کا زاویہ ابھرتا ہے۔

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا

اور اگر وزیر آغا خوابوں کے دیار کو چھوڑ رہے ہوں تو ان پر افسردگی سی طاری ہو جاتی ہے اور تمام منظر دھندلا جاتا ہے۔

حدِ افق پہ شام تھی خیمہ میں منتظر
آنسو کا اک پہاڑ سا حائل نظر میں تھا

جاتے کہاں کہ رات کی باہیں تھیں مشتعل
چھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا

شہر کی طرف پیش قدمی اور پھر گاؤں کی طرف مراجعت اس سفر مسلسل کے دو اہم مرحلے ہیں اور وزیر آغا پر بالکل الگ نوعیت کی کیفیات طاری کرتے ہیں۔ شہر کی طرف پیش قدمی بے دلی کی غماز ہے ، درختوں سے کٹی ہوئی اور کولتار کی سڑکوں سے اٹی ہوئی یہ فضا وزیر آغا کے تخلیقی مزاج کے ساتھ شاید مطابقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اس کا ردعمل ان کی غزل میں اپنی نمود واضح انداز میں کرتا ہے۔

کیسے کہوں کہ میں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ ، زمیں بے لباس تھی

میلوں تک تھی جھلسی ہوئی دوپہر کی قاش
سینے میں بند سینکڑوں صدیوں کی پیاس تھی

نکلے سفر پہ ہم تو قمر ہم رکاب تھا
پھر صبح تک رفاقت شب کا عذاب تھا

چھاؤں کا ایسا قحط پڑا اس برس کہ دھوپ
ہر سوکھتے شجر کے لیے سائباں ہوئی

چمن میں آ کہ عجب اپنے دل کا حال ہوا
نئی رتوں کا تماشہ بھی اک وبال ہوا

آئی شب یہ تو دیے جھلملا اٹھے
تھا روشنی میں شہر ہمارا بجھا ہوا

ہوتا ہے ذکر گلیوں میں اب بند شہر کا
اندھوں کے بند شہر میں کیسی ہوا چلی

لیکن جب وہ گاؤں کی طرف مراجعت کرتے ہیں تو انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود اپنی

جانب سفر کر رہے ہوں۔

چلتا رہا ہوں اپنی ہی جانب تمام عمر
تو نے غلط کہا کہ میں گھر سے نکل گیا

یہ سفر تنگ، مسموم اور بوجھل ہوا سے معطر، لطیف اور کشادہ ماحول کی طرف شوقِ فراوانی کا سفر ہے، چنانچہ اب چڑیوں کا شور سن کر وزیر آغا کی طبیعت چہک اٹھتی ہے۔ اوس کا ایک چھینٹا ان کے حواس کو بیدار کر دیتا ہے۔ یہاں اندھیرے کی تنگ گلیوں کے برعکس اجالے کا میدان ہے اور وزیر آغا فطرت کے رنگ بدلتے مناظر کے ہجوم میں پوری طرح سرشار نظر آتے ہیں۔

چمکتے تاروں کا وہ اژدہام ہے کہ مجھے
تلاش کرنے پہ بھی آسماں نہیں ملتا

پلک اٹھاؤ تو نیلے سمندروں کا خروش
پلک گراؤ، تو کچھ بھی یہاں نہیں ملتا

وہ برگِ سبز جس کو اڑا لے گیا تھا تو
ڈھونڈا تو مل گیا مجھے بن میں پڑا ہوا

وہ کبھی نیلا سمندر ہے کبھی سبز زمین
کبھی موجوں، کبھی پھولوں میں گھرا ہوتا ہے

اجلی ہوا میں ہم نے دیا ہے پروں کو کھول
اب جس طرف بہے گی ہوا، بہتے جائیں گے

تلاش کرتے ہوئے پھولوں میں، کیسے پاگل ہو؟
اُڑا کے لے بھی گئی صبح کی ہوا مجھ کو

بالفاظ دیگر وزیر آغا کا سفر بیک وقت شگفتگی کا باعث بھی ہے اور اس میں کرب کی لہر بھی موجزن ہے، یہ مسرت افروز بھی ہے اور اس میں غم کا شائبہ بھی موجود ہے۔ دونوں صورتوں میں وزیر آغا نے غزل کو اپنے صادق اظہار کا وسیلہ بنایا ہے، انہوں نے مسرت کو بے جا طور پر اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش نہیں کی اور افسردگی پر دبیز پردے نہیں ڈالے بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے غزل کو مسرت اور افسردگی کا حقیقی مرقع بنا دیا ہے۔ چنانچہ سفر کا استعارہ خود ان کی زندگی سے پھوٹتا ہوا اور شعر کے باطن میں فطری طور پر سماتا ہوا نظر آتا ہے۔

وزیر آغا کی غزل میں ''شام'' ایک اہم علامت کے طور پر اُبھری ہے۔ یوں تو ان کے ہاں رات، صبح، سورج اور دھوپ وغیرہ کی علامتیں بھی اپنی جلوہ آرائی معنی خیز طور پر کرتی ہیں۔ تاہم شام ان کے تخلیقی عمل میں ایک مخصوص کردار کی حامل ہے اور اس کے پس منظر میں دیومالائی تاثر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ دیومالا میں شام عورت کا وہ روپ ہے جب وہ بھیگنے والی ماں کا کردار ادا کرتی ہے۔ اپنے شکار پر کندے جھاڑ کر لپک پڑتی ہے۔ شام کے کردار کا یہ زاویہ وزیر آغا کے مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

کہتے ہو تم کہ خود میں سمٹنے لگی ہے شام
بھیگے پروں کے ساتھ جھپٹنے لگی ہے شام

کاسہ سے آفتاب کے بھر کے لہو کا جام
دامان آسماں پہ الٹنے لگی ہے شام

لیکن یہی شام جب رات کی جانب سرکتی ہے تو اس کی تمام وحشت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس نرم و گداز گود کو تلاش کرتی ہے جس میں سر رکھ کر آسودگی کا سانس لے سکے۔ اور اب شام ایک معصوم بچے کی طرح اپنی ماں کو تلاش کر رہی ہے۔ یہاں وزیر آغا نے رات کو ماں کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔

سورج کی گری مٹھی سے نکلتی تھی اور اب
کس کی گداز گود میں گرنے لگی ہے شام

شام کا کردار چونکہ نسوانی ہے اس لیے یہ دردمندی کے جذبے سے معمور ہے۔ یوں بھی دیو مالا کی رو سے شام محبوبہ ہے اور سورج نے ایک عاشق کا منصب سنبھال رکھا ہے۔ شام جب اپنے کٹھور محبوب کو زخمی دیکھتی ہے تو بے قرار ہو جاتی ہے اور اس لمحے اس کے ہاں دردمندی کا جذبہ بے اختیار بیدار ہو جاتا ہے۔

ماتھے پہ دن کے زخم سا دیکھا تو دوڑ کر
اس زخم کے شگاف کو بھرنے لگی ہے شام

وزیر آغا نے رات کو ماں کے روپ میں ہی پیش نہیں کیا بلکہ اسے حاملہ عورت کے مترادف بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورج وہ بچہ ہے جو ہر صبح اس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ سورج اور رات کا یہ دیو مالائی روپ وزیر آغا کے مندرجہ ذیل شعر میں عیاں ہے:

اس کا بدن تھا خون کی حدت سے شعلہ وش
سورج کا اِک گلاب سا طشت سحر میں تھا

غزل میں دیو مالا کا یہ بالواسطہ اظہار درحقیقت اس بات کو عیاں کرتا ہے کہ وقت کے تبدیل ہو جانے کے باوجود انسانی جذبات واحساسات میں کوئی نمایاں تبدیلی ظہور میں نہیں آئی۔ چنانچہ سورج، رات اور شام نے جس تخلیقی انداز میں اپنی نمود دیو مالا میں کی تھی اسی تخلیقی صورت میں یہ جدید غزل میں بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ وزیر آغا نے چونکہ دیہات کی طرح دیو مالا کا مطالعہ بھی فکری سطح پر خضوع وخشوع سے کیا ہے اس لیے یہ بھی ان کے تخلیقی عمل کا حصہ بن گیا ہے اور اس کے مختلف روپ لاشعوری طور پر ان کی غزل میں سما گئے ہیں اور ہمیں ایک نئے ذائقے اور ایک نرالی لذت سے آشنا کرتے ہیں۔

وزیر آغا نے نظم سے غزل کی طرف پیش قدمی کی ہے۔اس لیے ان کے ہاں نہ صرف روایت سے انحراف کا واضح فکری رجحان ملتا ہے بلکہ انہوں نے اپنے تخلیقی عمل کی تازہ کاری سے غزل کو جدیدیت کی طرف قدم بڑھانے اور پرانی کھائیوں سے نکلنے کا رستہ بھی دکھایا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ہاں تغزل روایتی انداز میں بالکل سامنے نہیں آتا۔ عشق سے پیدا ہونے والا ذاتی کرب بھی ان کی غزل کا حصہ نہیں بن سکا۔غزل کا محبوب ان کے تخلیقی نظام میں مناسب جگہ حاصل نہیں کر سکا۔ درد کی ایک لہر ان کی غزل کی زیر سطح موجود ہے لیکن یہ وہ درد ہے جو زمانے کے پست و بلند سے گزرنے والی موج رواں سے پیدا ہوا ہے اور وزیر آغا کے ہاں اس وقت بیدار ہوتا ہے جب وہ تھوڑے سے وقت کے لیے فطرت سے کٹ جاتے ہیں۔ اپنی غزل میں وزیر آغا اس معصوم صفت تپسوی کی صورت میں سامنے آئے ہیں جو فطرت کے بڑے نظام کا ایک حصہ ہے اور جس کے سامنے فطرت اپنے تمام بھید کھول دیتی ہے۔ یہ رابطہ اگر ٹوٹ جائے تو ان پر سوگواری، محرومی اور افسردگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور درد کی زیریں لہر غزل کی بالائی سطح ابھر آتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ اردو غزل بہت سے اہم موڑ کاٹ کر ''اینٹی غزل'' بننے کی سعی کر رہی تھی تو وزیر آغا نے اس کا رخ ایک مرتبہ پھر مثبت جدیدیت کی طرف موڑ دیا۔ چنانچہ وزیر آغا کی غزل تازہ ہوا کا وہ جھونکا ہے جس نے اس صنفِ ادب کو بوقلموں نیرنگی، رعنائی اور سحر کاری عطا کی ہے۔ یہ غزل وزیر آغا کے داخل اور خارج کی نمائندہ ہے۔ اس کے شگوفے وزیر آغا کے دل سے پھوٹے ہیں لیکن اس کا تمام منظر وزیر آغا کے گرد و پیش میں پھیلا ہوا ہے۔ وزیر آغا کی خوبی یہ ہے کہ ایک طویل عرصے تک نظم کی صنف کو زندہ رہنے والی تخلیقات عطا کرنے کے بعد جب وہ مائل بہ غزل ہوئے تو وہ تمام سرمایہ جو انہوں نے عمیق مشاہدے سے سمیٹا تھا اور ان کی نظم اور انشائیہ تنوع اور توانائی پیدا کر رہا تھا غزل کی صنف میں بھی سامنے لگا۔ چنانچہ مجید امجد، ناصر کاظمی، شہزاد احمد اور ظفر اقبال نے اُردو غزل میں جو نئی جہت پیدا کی تھی وہاں ایک طویل موڑ کاٹ کر اب غزل اپنا سفر وزیر آغا کی غزل کے سائے میں طے کر رہی ہے اور مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔ اردو غزل کی جدیدیت میں وزیر آغا کی اس عطا سے انکار ممکن نہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور انشائیہ

ڈاکٹر وزیر آغا شاید اردو کے واحد ادیب ہیں، جن کا نام اُردو ادب کی ایک صنف اظہار کے ساتھ کچھ اس پختگی سے وابستہ ہو گیا ہے کہ اب اس صنف کا تصور وزیر آغا کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ صنف ادب انشائیہ ہے اور اسے وسیع پیمانے پر متعارف کرانے، اس کا دائرہ تحقیق بڑھانے، تخلیقی نقوشِ فن اجاگر کرنے اور اس کی بوطیقا کی ترتیب و تدوین میں وزیر آغا نے سب سے زیدہ خدمات انجام دی ہیں۔ انشائیہ نگار کی حیثیت میں وزیر آغا کا طلوع 1954ء کے لگ بھگ ہوا تھا۔ اس وقت سرسید احمد خان سے لے کر ممتاز مفتی اور امجد حسین تک کے مضامین میں انشائیہ کے نقوش بکھرے بکھرے سے تھے۔ فنی بوطیقا غیر مرتب اور خستہ حالت میں تھی۔ اس کی کیفیت کچھ یوں تھی کہ لکھنے والوں کو خود یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ انشائیہ لکھ رہے ہیں۔ مولیئر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب اسے بتایا گیا کہ وہ تمام عمر نثر بولتا رہا ہے تو وہ حیران ہو گیا تھا۔ کچھ یہی صورت اردو کے انشائیہ نگاروں کی تھی جو ڈاکٹر جانسن کی وضع کردہ تعریف کے مدار میں لاشعوری طور پر داخل ہو جاتے تھے اور اپنے ذہن کی آزاد ترنگ سے غیر منظم، بے ترتیب اور غیر ہضم شدہ نثر کا مضمون پیش کر دیتے جو عنوان کی تشریح شرح و بسط سے کر دیتا تھا۔ لیکن انہیں یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ انشائیہ لکھ رہے ہیں۔ میں نے جب ایک مرتبہ معروف افسانہ نگار ممتاز مفتی کو بتایا کہ ان کی کتاب ''غبارے'' کے مضامین میں ''پہاڑ''، ''باپ'' اور ''بڑھاپا'' مکمل انشائیے ہیں اور ان کا شمار اردو انشائیہ نگاروں کے پیش رووں میں شامل کرنا واجب ہے تو انہوں نے کمال سادگی سے کہا:

''انور سدید! اس وقت تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ میں انشائیہ لکھ رہا ہوں۔ یہ بات تو میرے

سامنے تم نے کھولی ہے۔''

میرا خیال ہے کہ انشائیہ کی طرف وزیر آغا کی پیش قدمی بھی کچھ اسی قسم کی لاشعوری تھی۔ یعنی ابتدا میں شاید انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ انشائیہ لکھ رہے ہیں یا اردو ادب کی ایک نئی صنف کو متعارف کرا رہے ہیں۔ ان کا اس قسم کا پہلا نثر پارہ ماہنامہ ''ادبی دنیا'' (مدیر: مولانا صلاح الدین احمد) میں اپریل 1949ء میں ''بہار کی ایک شام'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ مدیر ''ادبی دنیا'' نے اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا:

''بہار کی ایک شام'' یوں تو موسم کی ایک چیز ہے لیکن اپنی خیال انگیز داخلی کیفیت کے اعتبار سے ایک مستقل ادبی اور نفسیاتی حیثیت رکھتی ہے۔''

مولانا صلاح الدین احمد کے اس تبصرے نے وزیر آغا کے تخلیقی ذہن کو مہمیز کیا اور انہوں نے اگلے چند سالوں میں داخلی تاثیر کے اس قسم کے متعدد مضامین لکھے لیکن خود انہیں بھی علم نہیں تھا کہ وہ ادب کی پگڈنڈی پر کوئی نیا چراغ روشن کر رہے ہیں۔ ان کے اس قسم کے مضامین کا پہلا مجموعہ 1961ء میں چھپا تو اس کا نام ''خیال پارے'' رکھا گیا۔ مولانا صلاح الدین احمد اپنے رسالہ ''ادبی دنیا'' میں وزیر آغا کے یہ مضامین پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک پارۂ انشاء (ان کے اپنے ارشاد کے مطابق غالباً اس کا عنوان ''لحاف'' تھا) پڑھا تو ایک معصوم بچے کی طرح کھل اُٹھے جیسے شرارت پر سزا دینے کی بجائے برفی اور قلاقند کے دو بڑے لفافے تھما دیے گئے ہوں۔ انہوں نے ''خیال پارے'' کی تقدیم میں لکھا ہے۔

''یہ تجویز یک بیک میرے ذہن میں آئی کہ آغا صاحب کے ان بکھرے ہوئے پاروں کو جمع کر کے ادب اردو کی ایک جدید ترین صنف کے اظہارِ اولیں کے طور پر اہل ذوق کی خدمت میں برملا پیش کر دیا جائے اور پھر ''ہر چہ باداباد'' ۔۔۔!''

''خیال پارے'' میں ''پگڈنڈی''، ''بے ترتیبی''، ''آگ تاپنا''، ''خاموشی''، ''ریل کا سفر'' اور ''بارش کے بعد'' جیسے عام موضوعات پر مصنف کے ذاتی وخلی زاویے سے تاثراتی انداز میں لکھے گئے بائیس مضامین شامل ہیں، اہم بات یہ ہے کہ اس دوران میں اس صنف کے تسمیہ کی بحث چل پڑی اور

جب اس کا نام ''انشائیہ'' طے پا گیا تو ان سب مضامین کو بھی انشائیہ تسلیم کر لیا گیا۔ 1966ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کا دوسرا مجموعہ ''چوری سے یاری تک'' شائع ہوا تو اردو کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے وزیر آغا کو اپنے پیش لفظ میں اس صنف کا مبتدی اور منتہی قرار دے دیا۔ وزیر آغا کے انشائیوں کے چند مجموعے ''دوسرا کنارہ'' (1982ء) اور ''سمندر اگر میرے اندر گرے'' (1989ء) '' شائع ہوئے تو انشائیہ اردو نثر کی ایک صنف کے طور پر قبول عام ہی حاصل نہیں کر چکا تھا بلکہ اس کا ایک حزب اختلاف بھی پیدا ہو چکا تھا اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ نظم نگاروں نے جس طرح غزل کے خلاف محاذ کھڑا کر رکھا تھا اسی طرح انشائیوں کے خلاف مضمون نگاروں اور خصوصاً خالص طنز و مزاح لکھنے والوں نے بھی مورچہ قائم کر لیا لیکن اب انشائیہ لکھنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور خود ڈاکٹر وزیر آغا اس صنف میں اعلیٰ پائے کے مضامین پیش کر رہے تھے۔ چنانچہ 2009ء کے لگ بھگ ان کے انشائیوں کے کلیات (روز رولر سے پگڈنڈی تک) کا دوسرا ایڈیشن چھپا تو جناب شاہد شیدائی نے ان کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

> ''اس مغربی صنف ادب کا اولیں تخلیق کار فرانس کا مونتین نامی ادیب تھا۔ (جسے اس کا موجد کہنا چاہیے) لیکن جب وزیر آغا نے اسے اردو میں متعارف کرایا تو سب سے پہلے انہوں نے یہ کام کیا کہ ''ہلکی پھلکی'' یا ''ذاتی'' قسم کی تحریر کہنے کی بجائے اس کے لیے انشائیہ کا نام پسند کیا جو زیادہ معنی خیز ہے۔ دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ مغرب کے پیٹرن کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ انشائیے کی شعریات میں مشرقی مزاج، اس کی ثقافت اور تہذیب یہاں کے رہن سہن اور مٹی کی بو باس کی آمیزش سے اسے منقلب کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے مشرقی دانش اور فکر سے منسلک کر کے انشائیہ نگاری کے امکانات میں بے پناہ اضافے کیے۔ مختصر یہ کہ انشائیہ نگاری کی تہذیب اور اس کے فروغ کے لیے وزیر آغا نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی روشنی میں انہیں اردو انشائیے کا اولیں تخلیق کار قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہیے۔'' (کلیات'' پگڈنڈی'' ص 380۔ لاہور 2009ء)

''خیال پارے'' میں ڈاکٹر وزیر آغا ہمیں انشائیہ نگاری کی دہلیز پر کھڑے نظر آتے ہیں اور وہ اشیاء

اور مظاہر کے نئے نئے روپ پیش کرنے کی کاوش کر رہے ہیں۔ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی نے رائے ظاہر کی:

"وزیر آغا کے مضامین کو جوں جوں پڑھتے جایئے،ان جانی ان بوجھی اور روزانہ کی دیکھی اور آزمائی ہوئی چیزوں کے بارے میں احساس ہوگا کہ ہم انہیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں یا اس سے پہلے ہم نے انہیں اس زاویے سے کیوں نہیں دیکھا۔تازگی اور تازہ کاری کا یہ عنصر ان مضامین کا نمایاں وصف ہے۔" ("شام کا سورج"۔ص 531)

اور جب وزیر آغا نے بہادری اور بزدلی میں کوئی خلیج حائل نہیں دیکھی اور "ترتیب" تصنع،اغماض اور بے رخی کا مشاہدہ کیا اور "ریلوے ٹائم ٹیبل" کو سب سے دلچسپ کتاب قرار دیا تو ڈاکٹر سلیم اختر بھی کھل اُٹھے اور انہوں نے نہ صرف "جھگڑا"،"وہ"،بہادری"،"آسیب"،"پنسل کی معیت میں" اور "اجنبی دیار میں" وغیرہ انشائیوں کے عنوانات بطور مثال اقتباس کیے بلکہ وزیر آغا کا انشائیہ "چالیسویں سالگرہ" کو چارلس لیمب کی کلاسیکی حیثیت کی مثال بھی قرار دے دیا اور لکھا:

"انشائیہ کے فروغ میں ڈاکٹر وزیر آغا اپنے وجود میں ایک تحریک ہیں۔"

وزیر آغا جدید اردو نظم کے ممتاز ترین شعرا میں شمار ہوتے تھے۔انہوں نے اردو تنقید میں اپنا منفرد زاویہ نظر پیدا کیا اور اردو ادب کو مغرب کے جدید علوم سے متعارف کرایا۔اور زندگی کے آخری دور میں "امتزاجی تنقید" کا نظریہ پیش کیا۔تاہم انشائیہ کو ان کے تخلیقی عمل میں ہمیشہ اہمیت حاصل رہی اور اس کی تحسین ان کے معاصرین نے بھی کی تو یوسف ظفر نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وزیر آغا نے انشائیہ اس لیے لکھا ہے کہ۔

"زندگی کی وسعتوں،اس کی ہمہ گیری اور گہرائی۔۔۔اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ پہلو کے معمولی جزو کے ناقص سے ناقص نکتے کو بھی دائرہ امکان بنا دیں۔اور اس کے محرابوں میں قندیل ہائے خیال کا ایک سلسلہ اس طرح فروزاں کریں کہ ذہن کا ہر زاویہ خانۂ آفتاب بن جائے۔"

ہندوستان کے ممتاز دانشور جوگندر پال کی رائے میں:

"وزیر آغا کا انشائیہ بیک وقت مختلف کیفیتوں میں بہہ رہا ہوتا ہے۔یہاں ہموار سطح پر،ایک سیدھ میں،یہاں کوئی موڑ لیتا ہوا،یہاں امنڈا

امنڈا۔۔۔ یہاں آنکھیں موندے۔ وزیر آغا کا یہ نہایت فطری انداز ان کے
فارم (FORM) کے سرسبز پیڑوں کا ہے جو بظاہر اتنے سادہ نظر آتے ہیں اور
اپنی ساری پیچیدگیاں اپنے اندر ہی اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ اور انہیں یوں
لہلہاتے ہوئے دیکھ کر انہی کے مانند لہلہانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔''

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ وزیر آغا نے اپنا پہلا انشائیہ 1949ء میں لکھا تھا۔ پھر ان کی زندگی اور انشائیہ ساتھ ساتھ چلتے رہے تا آنکہ 7 ستمبر 2010 کو اپنی عمر عزیز کے اٹھاسی (پ 18 مئی 1922) برس گزار کر اور انشائیہ کے ساتھ نصف صدی بسر کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس تمام عرصے میں انہوں نے متعدد انشائیے متنوع موضوعات پر لکھ کر اس بات کی پختہ شہادت دے دی کہ انشائیہ میں نہ صرف عام انسانی دلچسپی کے سامان موجود ہیں بلکہ ایسی انسانی اقدار بھی ہیں جو زندگی کے کٹھن اور پر آشوب سفر کو لطیف اور خوش گوار بناتی ہیں۔ وہ انشائیے میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی بازیافت تخلیقی سطح پر کرتے ہیں اور اس کے انوکھے زاویے سامنے لا کر ہمیں مسرت و بہجت سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں دیہات عقبی دیار بھی ہے اور یہ فطرت کے حسن اور اس کی دل آویزیوں کے سمیٹنے کا وسیلہ بھی ہے۔ دیہات ایک ایسی انجمن ہے جہاں انسان کبھی تنہائی کا شکار نہیں ہوتا۔ وزیر آغا کے لیے یہ احساس ہمیشہ تلخ رہا کہ فطرت اور انسان کے درمیان شہر نے ایک اونچی دیوار کھڑی کر رکھی ہے اور بیسویں صدی کے ربع آخر میں یہ دیوار سرکنے اور دیہات پر یلغار کرنے لگی تھی۔ وہ فٹ پاتھوں اور سڑکوں میں گھرے شہر کو طمانیت کی نظر سے نہیں دیکھتے اور اپنے احساس کی لرزاں کیفیت کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

''جب سرخ ساڑھی میں لپٹی ہوئی شام آسمان کے بام و در سے
لحظہ بھر کے لیے جھانکتی ہے تو میں چھڑی ہاتھ میں لیے گنجان سڑک کے ساتھ چلتے
ہوئے فٹ پاتھ پر چہل قدمی کے لیے نکل آتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ شاید
آج حسنِ فلک کے درشن کر سکوں۔ لیکن آسمان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی
دیواروں کے اس شہر میں میری نظریں اس تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اس کے بجائے
میں اس سیاہ پوش بکھرے ہوئے جم غفیر کا نظارہ کر کے لوٹ آتا ہوں جو میرے
دائیں ہاتھ بہتی ہوئی سڑک پر سائیکلوں، تانگوں، موٹروں، سکوٹروں اور

رکشاؤں کی صورت میں رواں دواں ہے۔اس وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں
کسی تیز رفتار پہاڑی دریا کے کنارے یا متلاطم سمندر میں گھرے کسی خاموش
اور تنہا جزیرے میں کھڑا سرکش موجوں کا نظارہ کر رہا ہوں؛"

آپ نے دیکھا کہ جب وزیر آغا نے ہجوم کی دیوار اور عمارتوں کی آسمان سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی دیواروں سے تعلق قائم کیا تو "دیوار" کے غیر اہم موضوع کو بھی اہمیت مل گئی اور حقیقت کو اپنی نمود کا زاویہ نئے انداز میں سامنے لانے کا موقع مل گیا جس نے عقب میں دیہات کی محبت کا زوال رخ موجود تھا۔اس قسم کے انوکھے انکشافِ حقیقت کے متعدد زاویے وزیر آغا کے انشائیوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ان میں عرفانِ حقیقت بھی ہے اور اک دانش بھی۔انہوں نے اپنے انشائیوں کی کلیات "پگڈنڈی" (2009) میں حقیقت کے داخل سے اس غنچے کو تلاش کرنے کی کاوش کی ہے جو کھلے تو پھول بن جاتا ہے اور جس کی خوشبو اطراف و جوانب کو معطر کر دیتی ہے۔ان کے مختلف عنوانات کے انشائیوں سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"تقسیم کا وصف عورت کی فطرت میں شامل ہے۔جس طرح دھرتی
ایک بیج کو سینکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے اور درخت خود کو لاکھوں شاخوں اور
پتوں میں بانٹ دیتا ہے،بعینہٖ عورت ازل سے اپنے گھر کو کوٹھڑیوں اور سامان کو
پوٹلیوں میں تقسیم کرتی آئی ہے۔"

(سیاح)

☆☆☆
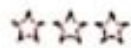
بہادری ایک ناتراشیدہ جذبہ ہے۔۔۔جذبہ جو سطحیت میں لپٹا ہوا
ہے۔اس کے پس منظر میں کسی ذہنی ارتقا کے نقوش نہیں ملتے،اس کے برعکس
بزدلی انسان کے تدریجی،ذہنی،سماجی اور ارتقا کا نتیجہ ہے۔نثری نظم کی طرح
بزدلی بھی مستقبل کی چیز ہے۔چنانچہ وہ دن دور نہیں جب بہادری کا ہر کارنامہ
قابلِ دست اندازیٔ پولیس قرار پائے گا اور بزدلی کے ہر فعل پر قوم کی طرف
سے انعامات تقسیم ہوا کریں گے۔"

(بہادری)

''پتنگ کی خوبی یہ ہے کہ وہ فلک کی بات زمین کے محرم تک پہنچانے کا اہتمام کرتی ہے۔ اس کے ذریعے انسان اپنی چھوٹی، تنگ، منافقتوں، نفرتوں اور دکھوں کی زد میں آئی ہوئی زندگی سے اوپر اٹھ کر آسمان کی فراخ اور بے داغ دنیا کا باسی بن جاتا ہے۔ یعنی اس کے پاؤں تو گھر کی چھت سے ہی جڑے ہوتے ہیں مگر اس کا تخیل شہر کے بندی خانے سے نکل کر آسمان کی بے نہایت فضا میں پرواز کرنے لگتا ہے۔ تب وہ حیرت سے سوچتا ہے کہ کائنات کتنی بڑی ہے اور اس کائنات کو بنانے والا کتنا عظیم ہے اور اس کے اپنے چھوٹے چھوٹے گھر اس کائنات میں کتنے بے معنی ہیں۔ (بسنت)

انشائیہ نگاری کے لیے ذاتی حوالے کی شرط لگائی گئی ہے۔ اس کے تابندہ نقوش وزیر آغا کے انشائیوں میں جا بجا چھپے ہوئے ہیں اور اکثر اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وزیر آغا انشائیے کے وسیلے سے خود اپنی ذات کی یاترا کر رہے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے درست لکھا ہے کہ

''وزیر آغا کا انشائیہ ان کی رنگا رنگ شخصیت کا عکسِ جمیل ہے۔ ان کی طبیعت میں جو دل آویزی، رچاؤ، شائستگی ہے۔ زمین اور اس کے رشتوں کو انہوں نے جس طرح چاہا ہے اور برتا ہے وہ ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔''

(فلیپ، چوری سے یاری تک)

چنانچہ وزیر آغا کے انشائیوں میں ان سے ہماری ملاقات بالمشافہ ہوتی ہے اور وہ ہمیں اس کائنات کے ایسے تماشائی دکھائی دیتے ہیں جو تماشے میں شامل ہو کر زندگی کی رعنائیوں کو انوکھے انداز میں سمیٹ رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے حال کے لمحے کو گلاب کے پھول کی مانند اپنے کوٹ کے کالر میں سجا رکھا ہے اور زندگی کے ہر کٹھن موڑ پر اس کی دلفریب گاڑھی خوشبو اپنے حساس نتھنوں سے سونگھتے چلے جا رہے ہیں اور پھر اس خوشبو کو لفظوں کے حصار میں لے کر انشائیے میں شامل کر دیتے ہیں۔ آئیے واحد متکلم کے تجربات، مشاہدات اور پھر ان کے تجزیے میں شامل ہونے اور اپنے ذوق وظرف کے مطابق نتائج نکالنے اور ثمرات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

''میں نے زندگی بھر ریل میں سفر کیا ہے پھر کار میں۔ دونوں گاڑیاں جب رفتار پکڑتی ہیں تو ہر شے اتھل پتھل ہو جاتی ہے۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کی رفتار ایک تیز چمکتی ہوئی دو دھاری تلوار کی طرح ہیست کے سینے میں اتر گئی ہے اور ٹھہری ہوئی اشیاء زخمی ہو کر تڑپنے لگی ہیں۔ مگر میں نے ریل یا کار میں سفر کرتے ہوئے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ ریل یا کار تو آگے کو حرکت کر رہی ہے اور وہ اشیاء جنہیں یہ ٹھوکر لگا کر کچی نیند سے بیدار کرتی ہے ایک عمل معکوس کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیچھے کی طرف اٹھ بھاگتی ہیں۔۔۔ درخت، ٹیلے، مکان، فیکٹریاں، پل، دریا، نہریں وغیرہ۔۔۔ یہ سب ریل یا کار کے الٹی سمت میں اتنی تیزی سے بھاگتی ہیں کہ انسان سوچتا ہے کہ شاید یہ گھر پر کوئی قیمتی چیزیں بھول آئی ہیں اور اب جلد از جلد واپس جا کر اسے اپنی تحویل میں لینا چاہتی ہیں۔''

(چند روز ایک روڈ رولر کے ساتھ)

''پچھلے دنوں میں چند روز کے لیے ایک دوست کے گھر جا کر رہا۔ میرے اس دوست کو مرغیاں پالنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کا مرغا اپنے حرم میں دندناتا پھرتا ہے۔ یہ مرغا خودنمائی نخوت اور چالاکی کا ایک زندہ مجسمہ تھا اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے جبر اور غنڈہ گردی میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے سوچا یہی مرغا جنگل کا باسی تھا تو دوسرے پرندوں اور جنگل جانوروں کے رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا تھا مگر اب خدا جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ ویسے فطرت کے رنگ بھی نرالے ہیں۔ یعنی جب اس کی طرف سے اشارہ ہوتا ہے تو مادہ طبلہ، عطار بن جاتی ہے اور اس کی خوشبو نر کو بے دست و پا کر دیتی ہے۔ لیکن جیسے ہی فطرت کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ خوشبو کے پھیلاؤ کا سلسلہ بند کر دیتی ہے اور نر اور مادہ دونوں بھول جاتے ہیں کہ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ معاً میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مرغے نے تہذیب کی یہ کروٹ غالباً انسان سے مستعار لی ہے۔''

(کچھ اپنوں کے بارے میں)

"مجھے کھلونے اچھے نہیں لگتے لیکن جب بچے کھلونوں سے کھیل
رہے ہوں تو وہ بہت اچھے لگتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ بچے تو کھلونوں سے
کھیلتے ہیں اور ہم بچوں سے۔ شاید زندگی بھر انسان کی ان کھلونوں سے کھیلنے کی
جبلت تر و تازہ رہتی ہے۔ آخر بچے بھی کھلونے ہی تو ہیں۔ جب ہم ان سے
کھیلتے ہیں تو واپس اپنے بچپن میں پہنچ جاتے ہیں۔"

(کھلونے)

☆☆☆

"وزیر آغا نے اپنی زندگی کی تمام رسمی باتیں اپنی خود نوشت سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" میں بلا کم و کاست بیان کر دی ہیں لیکن انشائیوں میں ان کی باتیں سراسر غیر رسمی اور شگفتہ انداز میں سامنے آتی ہیں اور موضوع کے سیپ کو کھولتی چلی جاتی ہیں۔ اس عمل میں حقیقت کا گوہر تابدار برآمد ہوتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وزیر آغا صدف کو ہمارے حوالے نہیں کرتے بلکہ اس کے زاویے بدل بدل کر روشنیوں اور سایوں کا امتزاج عمل میں لاتے ہیں اور ایسی نیرنگی نظر پیدا کرتے ہیں کہ ہم فرطِ مسرت سے بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ بلا شبہ وزیر آغا کے باطن میں ایک شگفتہ مزاج انسان ظریف بھی موجود ہے لیکن وہ کسی شے مظہر یا خیال کو مضحک انداز میں پیش نہیں کرتے بلکہ مزاح کو موضوع کے بطن سے پھلجھڑی کی طرح برآمد کرتے ہیں تا کہ ان کا قاری انکشافِ نو پر شائستہ انداز میں مسکرا سکے۔ ان کے انشائیوں میں مزاح کو سنجیدہ حربے سے ابھارا گیا ہے اور صورت واقع کی یکسر تقلیب کر دی گئی ہے۔

"چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں مشغلہ بھی ہے اور ہم نے اسے لیل و نہار
کی ہزاروں کروٹوں کے باوجود نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس میں ہزاروں شگافیاں
اور فنی باریکیاں بھی پیدا کی ہیں۔"

(چوری سے یاری تک)

☆☆☆

"جب آپ سگریٹ ساگا کراس کے نیلے پیلے مرغولوں کے جال میں
محبوس ہو جاتے ہیں تو آپ کے اور کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والے مسافروں کے

درمیان غیریت کا ایک پردہ سا تن جاتا ہے۔ جو اشتراک اور بھائی چارے کے
بین الاقوامی موقف کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ جب کہ حقہ کا شغل اختیار کرتے
ہی آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے چاروں طرف سے نیم وا آنکھیں آپ کو پیار سے
گھورنے لگی ہیں اور جسموں میں بے وجہ سی کسمساہٹ سی ہونے لگی ہے۔ معاً کوئی
جان تو اس آپ کی طرف آہستہ آہستہ کھسکتی ہے۔ حتیٰ کہ حقے کی نے اس کے منہ
کے زد میں آجاتی ہے اور پھر آپ دیکھتے ہیں کہ کمپارٹمنٹ کے سارے غنچہ دہن
آپ کے گرد ایک دائرے کی صورت میں جمع ہو گئے ہیں اور آپ کا ہاتھ جس نے
حقہ تھام رکھا تھا بڑے پراسرار مشینی انداز میں حقے کی نے کو گھمانے لگتا ہے......"

(حقہ پینا)

☆☆☆

"اپنے ملک کے اہل سیاست پر نظر ڈالیے جنہوں نے آندھی سے
سبق حاصل کیا اور ہوا کا رخ دیکھ کر چلے اور ہوا کا رخ ذرا بھی بدلا تو ان لوگوں
نے اپنی مصروفیات بالائے طاق رکھ کر سب سے پہلے اپنا رخ تبدیل کیا۔ آج
عزت و ثروت ان کے گھر کی لونڈیاں ہیں۔ آج زمانہ ان کے قدموں کا غبار
ہے۔ آج ان میں سے ہر شخص آندھی کو راستہ دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

(آندھی)

☆☆☆

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کی کائنات بوقلموں ہے۔ انہوں نے اس صنف کے وسیلے سے
مظاہر کے مخفی معانی منکشف کیے اور اپنی تازہ کاری اور ندرتِ اظہار سے انکشافِ ذات کیا تو عرفانِ
کائنات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ ان کے انشائی عمل میں سنجیدہ فکری بھی ہے اور شگفتہ نگاری بھی
اور یہی وجہ ہے کہ انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی کہکشاں مرتب ہو جانے کے باوجود اس صنف ادب کے
آفاق پر جو روشنی سب سے نمایاں ہے اس کا ماخذ و مصدر وزیر آغا کا انشائیہ ہی ہے۔

☆☆☆

بعض لوگوں نے اسے وزیر آغا کی منظوم سوانح عمری قرار دیا جس میں زندگی کی پوری کہانی موجود ہے لیکن آغا صاحب نے اسے صرف اپنے محسوسات کے مد و جزر کی داستان قرار دیا جس کے عقب میں پھیلے ہوئے وہ صد ہا واقعات و حادثات موجود نہیں تھے، جن سے یہ محسوسات پیدا ہوئے اور جن کے بالواسطہ اور بلاواسطہ اثرات سے یہ نظم تخلیق پائی تھی۔ دوسرے نظم کے فنی ضابطوں اور پابندیوں میں کوئی مفکر اور دانشور، ادیب اپنے تصورات و افکار کا تجزیہ اتنی آزادی سے نہیں کرسکتا جتنا نثر کی صنف میں ممکن ہے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ انہیں اپنی کہانی ایک بار پھر سنانی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گاؤں وزیر کوٹ میں اپنا قیام بڑھا دیا۔ گجر دم اٹھتے اور اپنے پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ ان کا ذاتی ملازم محمد حسین چائے کی میز ان کے قریب کر دیتا جس پر ان کی شاعری کی اس وقت تک کی چھپی ہوئی نظم کی کتابیں "شام اور سائے"، "دن کا زرد پہاڑ"، "نردبان"، "آدھی صدی کے بعد" اور "گھاس میں تتلیاں" ترتیب وار رکھی ہوتیں۔ ان کتابوں کی تمام نظمیں وزیر آغا کی زندگی کا حصہ ہیں، ہر نظم کے باطن میں کوئی واقعہ یا کہانی موجود ہے جس نے ان کی تخلیقی شخصیت کو تیسری آنکھ سے دیکھنے کی کاوش کی تو ایک مربوط کہانی مرتب ہوتی چلی گئی جو نثر میں لکھی گئی تو ایک واقعے سے دوسرے واقعے تک کا خلاء یادوں کی الٹی چلنے والی فلم نے مکمل کر دیا۔

میں نے یہ آپ بیتی دسمبر 1986ء میں اشاعت کے بعد پڑھی تو اسے اردو کی ایک ایسی منفرد خودنوشت سمجھا، جس کا تمام مواد مصنف نے اپنی شعری تخلیقات سے بازیافت کیا تھا۔ بالفاظ دیگر "شام کی منڈیر سے" وزیر آغا کی متعدد نظموں کی تخلیقی مکرر قرار دی جاسکتی ہے تو یہ اعتراف کرنا بھی مناسب ہے کہ وزیر آغا یہ طویل نثری نظم دوسروں کو نہیں سنا رہے بلکہ وہ خود اس کے سامع ہیں۔ لیکن جب کتاب چھپ گئی تو اہل نظر نے تسلیم کیا کہ آغا صاحب نے انہیں اپنی خلوت میں جھانکنے کی اجازت دے دی ہے اور اب ہم اسے ایک ایسی خودنوشت سوانح عمری قرار دے سکتے ہیں جس میں شخصیت کو نمایاں کرنے کی بجائے افکار کی نشو و نما اور نظریات کے ارتقا کو فوقیت دی گئی ہے۔ بلاشبہ زمانی واقعات، حالات اور سماجی کرداروں کو نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن میں اسے خودنوشت کی فنی ادبی اور سماجی ضرورت قرار دوں گا کہ تفصیلی فریضہ ادا کرنے کے بعد اب یہ کتاب زمانے کی عدالت میں ہے اور قارئین کرام ہی اس کے منصف ہیں، جب کہ وزیر آغا کی ادبی اور سماجی شخصیت کی پوری آگہی کے لیے یہ سب کچھ ضروری تھا۔

"شام کی منڈیر سے" کا پہلا نقش جو 1986ء میں چھپا، سفر اوّل (1922 تا 1949)

"مجھے کھلونے اچھے نہیں لگتے لیکن جب بچے کھلونوں سے کھیل رہے ہوں تو وہ بہت اچھے لگتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ بچے تو کھلونوں سے کھیلتے ہیں اور ہم بچوں سے۔ شاید زندگی بھر انسان کی ان کھلونوں سے کھیلنے کی جبلت تر و تازہ رہتی ہے۔ آخر بچے بھی کھلونے ہی تو ہیں۔ جب ہم ان سے کھیلتے ہیں تو واپس اپنے بچپن میں پہنچ جاتے ہیں۔"

(کھلونے)

☆☆☆

"وزیر آغا نے اپنی زندگی کی تمام رسمی باتیں اپنی خود نوشت سوانح عمری "شام کی منڈیر سے" میں بلا کم کاست بیان کر دی ہیں لیکن انشائیوں میں ان کی باتیں سراسر غیر رسمی اور شگفتہ انداز میں سامنے آتی ہیں اور موضوع کے سیپ کو کھولتی چلی جاتی ہیں۔ اس عمل میں حقیقت کا گوہر تابدار برآمد ہوتا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ وزیر آغا صدف کو ہمارے حوالے نہیں کرتے بلکہ اس کے زاویے بدل بدل کر روشنیوں اور سایوں کا امتزاج عمل میں لاتے ہیں اور ایسی نیرنگی نظر پیدا کرتے ہیں کہ ہم فرطِ مسرت سے بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ بلاشبہ وزیر آغا کے باطن میں ایک شگفتہ مزاج انسان ظریف بھی موجود ہے لیکن وہ کسی شے مظہر یا خیال کو مضحک انداز میں پیش نہیں کرتے بلکہ مزاح کو موضوع کے بطن سے پھلجھڑی کی طرح برآمد کرتے ہیں تا کہ ان کا قاری انکشافِ نو پر شائستہ انداز میں مسکرا سکے۔ ان کے انشائیوں میں مزاح کو سنجیدہ حربے سے ابھارا گیا ہے اور صورت واقع کی یکسر تقلیب کر دی گئی ہے۔

"چوری ہمارا پیشہ ہی نہیں مشغلہ بھی ہے اور ہم نے اسے لیل و نہار کی ہزاروں کروٹوں کے باوجود نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس میں ہزاروں شگافیاں اور فنی باریکیاں بھی پیدا کی ہیں۔"

(چوری سے یاری تک)

☆☆☆

"جب آپ سگریٹ سلگا کر اس کے نیلے پیلے مرغولوں کے جال میں محبوس ہو جاتے ہیں تو آپ کے اور کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے والے مسافروں کے

''دھرتی کی آواز'' کے عنوان سے 1946ء میں چھپی جب وہ تین برس پہلے معاشیات میں ایم اے کر چکے تھے۔ اس دوران میں ان کے والد نے انہیں فوج میں لیفٹیننٹ بھرتی کرانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن وزیر آغا نے انکار کر دیا اور وجہ بتائی:

''میں اس قوم کے ساتھ کیسے تعاون کر سکتا ہوں جس نے ہمیں صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور جو نسل در نسل ہمارا خون پی رہی ہے۔'' (ص 47)

وزیر آغا کے والد مسکرائے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ وزیر آغا اب آزاد تھے لیکن والد صاحب نے انہیں گھوڑوں کے کاروبار میں لگانا چاہا اور مطالعاتی دورے پر بمبئی اور پونا بھیج دیا۔ وزیر آغا گھوڑوں کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل کر کے واپس آئے لیکن اس سفر میں وہ فطرت سے مواتست کے نئے خواب دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے گھوڑوں کا کاروباری بننے کی بجائے زمین سے محبت پیدا کی، کاشتکاری اختیار کر لی۔ دھرتی کا تصور جاگا تو یہ ماں کے تصور کے مماثل قرار پایا اور وزیر آغا کی تخلیقی تنہائی کی شخصیت کا جزو بن گیا۔ اس دور میں وزیر آغا نے اپنے باطن کی سیاحت میں گہری دلچسپی لی اور یہ چند اہم سوالات ان کے دل میں پیدا ہو رہے تھے:

''کائنات کا اسرار کیا ہے؟''

''حقیقت عظمیٰ سے میرا رشتہ کیا ہے؟''

''میں کیوں ہوں اور یہ کائنات کس لیے ہے؟''

تجسس اور تلاش کے اس مرحلے پر مولانا صلاح الدین احمد اور د، ع، خ نے ان کی راہنمائی کی اور ان کے بھانجے شمس آغا ان کے ہم سفر بن گئے۔ واضح رہے کہ د، ع، خ ان کے والد گرامی تھے جو اب ان کے دوست بن گئے تھے اور تصور اور ویدانت کے رموز و اسرار انہیں سمجھاتے تھے۔ شمس آغا اور وزیر آغا پر اس تعلیم نے متضاد اثرات مرتب کیے۔ شمس آغا، جس نے ایک اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار کی شہرت حاصل کر لی تھی اپنے وجود کے سوالوں میں ایسا گم ہوا کہ پھر اس کا پتہ نہ ملا۔ وزیر آغا نے اس کے برعکس زندگی کو ایک نعمت سے تعبیر کیا اور اس کا رس نچوڑنے کی بجائے اس کی معنویت دریافت کرنے کے لیے ادب کی طرف آ گئے۔ ''ادبی دنیا'' کے دور پنجم میں مولانا صلاح الدین احمد کی معاونت کی اور ان کی

''شام کی منڈیر سے''سوانح عمری

اب مجھے یہ تو یاد نہیں کہ اردو کے نامور نقاد، ممتاز شاعر، منفرد انشائیہ نگار اور ادبی جریدہ ''اوراق'' کے مدیر ڈاکٹر وزیر آغا نے غزل کا یہ شعر کب کہا تھا۔

دن ڈھل چکا تھا، اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا

لیکن جب میں نے یہ شعر پڑھا تو بے اختیار کہہ اٹھا کہ اس میں خودنوشت سوانح عمری کا عنصر موجود ہے۔ بلاشبہ یہ شعر زمانہ حال کا بیانیہ ہے اور مصرعہ ثانی میں رجائیت کا زاویہ بھی موجود ہے لیکن اہمیت اس شعر کے ابتدائی الفاظ ''دن ڈھل چکا تھا'' کو حاصل ہے جو اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ زندگی کی شام کے سائے نمودار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے دوست سجاد نقوی سے شعر کے اس تجزیے کا ذکر کیا تو ان سے درخواست کی کہ وہ وزیر آغا صاحب کو اپنی ''سوانح عمر گزشتہ کا احوال'' تالیف کرنے پر آمادہ کریں اور انہوں نے مجھے یہ بتا کر حیرت زدہ کر دیا کہ آغا صاحب اپنی عمر گزشتہ کا احوال ''شام کی منڈیر سے'' کے نام سے لکھ چکے ہیں اور اب نواحی گاؤں لالیاں میں صغیر شیروانی اس کی کتابت کر رہے ہیں۔ انہوں نے دلچسپ بات یہ بھی بتائی کہ اوپر لکھا ہوا شعر وزیر آغا پر اس روز اترا جب وہ اپنی آپ بیتی کا آخری صفحہ لکھ چکے تھے اور یہ احساس زندہ تھا کہ زندگی کا سفر جاری ہے اور اب راہ نورد حیات وہ مناظر دیکھے گا اور ان میں فعال حصہ لے گا جو شام کی منڈیر سے انہیں نظر آئیں گے۔

یہ 1986ء کی بات ہے۔ چند سال پہلے ان کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' شائع ہوئی تو

قیام (1949 تا 1959) مزید سفر (1959 تا 1975) اور قیام (1975 تا 1980) پر مشتمل ہے۔ 1980ء کو انہیں پھر سفر درپیش ہوا تو اس سفر کے دوران میں ہی یہ آپ بیتی لکھی گئی۔ اس لیے اس سفر کو وزیر آغا نے جاری قرار دیا ہے۔ تاہم 2002ء میں انہیں اس خودنوشت کو آگے بڑھانے کا خیال آیا تو آخری سفر کا عرصہ 1980 تا 1986 مقرر کیا جو اس کتاب کی اشاعت کا سال ہے۔ لیکن یہ سفر اسی کتاب کے دوسرے حصے میں (نیا ایڈیشن اضافے کے ساتھ) 1999 تک جاری ہے۔ اور 1999 سے تا حال (2009) کو انہوں نے قیام سے تعبیر کیا ہے۔ آپ انہیں اس کتاب کے سات ابواب بھی قرار دے سکتے ہیں جن کے زمانی تسلسل سے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی زندگی پر خود نظر ڈالی ہے۔ یہاں اس کا اجمال پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

وزیر آغا نے زندگی کا سفر 18 مئی 1922ء کو سرگودھا کے نواحی گاؤں وزیر کوٹ سے شروع کیا جو ان کے دادا آغا وزیر علی خان قزلباش کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ ان کے والد آغا وسعت علی خان (جو گیان دھیان کی طرف راغب ہوئے تو و، ع، خ کے نام سے معروف ہوئے) گھوڑوں کے سوداگر تھے۔ انگریزی سرکار کو گھوڑوں کی ضرورت لاحق ہوئی تو ''گھوڑے پال سکیم'' کے تحت اپنی شرائط پر زمینیں الاٹ کیں اور وزیر آغا کا خاندان لاہور سے وزیر کوٹ منتقل ہو گیا۔ بیسویں صدی کے ربع دوم میں جو اقتصادی بدحالی آئی تو یہ خاندان بھی اس سے متاثر ہوا۔ اور وزیر آغا کا لڑکپن انتہائی عسرت میں گزرا۔ لیکن انہوں نے لکھا ہے:

> ''لڑکپن کے ایام خوشیوں سے معمور تھے۔ غربت کا ہمیں احساس تک نہیں تھا۔ کیوں کہ ہم اپنے سے بہتر معیارِ زندگی سے واقف ہی نہیں تھے۔ گاؤں کے دوسرے باسیوں کا حال اتنا پتلا تھا کہ ان کے مقابلے میں ہم خود کو شہزادے سمجھتے تھے۔ مگر اس سلسلے میں احساسِ برتری میں مبتلا نہیں تھے۔''

وزیر آغا نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں حاصل کی اور میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے 1937ء میں پاس کیا، ایف اے جھنگ کالج سے کیا جہاں ممتاز عالمی سائنس دان عبدالسلام ان سے سینئر طالب علم تھے۔ جھنگ میں وہ ایف اے میں اول آئے تھے۔ بی اے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ انبوہ میں تنہا ہیں۔ اس تنہائی کے داخلی کرب نے ان کے اندر کے شاعر کو بیدار کیا اور وہ انگریزی اور اردو میں نظمیں لکھنے لگے۔ لیکن ان کی پہلی نظم ''ساقی'' دہلی میں

وفات کے بعد اپنا رسالہ ''اوراق'' جاری کیا۔ ادب کی آبیاری اپنے نئے مطالعے کی روشنی میں کی، جدید شاعری کے ساتھ انشائیہ کی صنف کو فروغ دیا اور ''نظم جدید کی کروٹیں''، ''اردو ادب میں طنز و مزاح''، ''اردو شاعری کا مزاج''، ''تخلیقی عمل''، ''تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں''، ''مجید امجد کی داستان محبت''، ''غالب کا ذوقِ تماشا'' جیسی یک موضوعی کتابیں لکھیں۔ ایک درجن سے زیادہ کتابوں میں ان کے متنوع موضوعات کے مضامین شامل ہیں۔ ان کی جدید شاعری کی پہلی کتاب ''شام اور سائے'' (1964) تھی۔ اور ''ہوا تحریر کر مجھ کو'' 2009ء میں شائع ہوئی۔ ''چمک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' ان کی ایک کلیات کا نام ہے۔ فیصل ہاشمی نے ان کی منتخب نظموں کا مجموعہ ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں'' مرتب کیا اور 2009ء میں اوسلو سے شائع کیا۔

''شام کی منڈیر'' شاید اردو کی پہلی خودنوشت ہے جس میں مصنف نے انکشافِ ذات کے لیے اپنی تخلیقات کو استعمال کیا ہے۔ انہوں نے ادب کے جدید زاویوں کو علوم کی نئی روشنی میں دریافت کیا اور اپنے معاصرین کے ذہنی افق کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مخالفت بالعموم ان شہرت پسند ادیبوں نے کی جو یک رخی شاعری کرتے تھے۔

تاہم ان مخالفین نے بھی وزیر آغا کو ایک دبستان فکر کا بانی شمار کیا لیکن اس قسم کا دعویٰ خود وزیر آغا نے کبھی نہیں کیا۔ ''شام کی منڈیر سے'' پڑھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وزیر کوٹ میں وزیر آغا کی چار مربع اراضی کی وسعت کا اندازہ غلط لگانے والوں نے انہیں ''جاگیردار'' موسوم کیا اور ''اوراق'' میں لکھنے والوں کو ان کا ''مزارع'' شمار کیا۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں 'میرا جی' کو جدید اردو شاعری میں ''دھرتی پوجا کی مثال'' قرار دیا تو ان کی مراد میرا جی کا دھرتی سے عشق تھا۔ لیکن بعض لوگوں نے اس ترکیب کو بطور دشنام ان پر استعمال کیا۔ یہ طوفان اس وقت تھا جب 1965ء کی جنگ کے بعد ''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد'' کا نغمہ گلی کوچوں میں گایا جانے لگا اور ارض وطن کو مقدس مقام دیا گیا۔

''شام کی منڈیر سے'' اس حقیقت کو بھی سامنے لاتی ہے کہ وزیر آغا کی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' کے خلاف بھی منفی پراپیگنڈے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا جب کہ انہوں نے دیباچہ میں واضح طور پر لکھا تھا:

> ''کسی زبان کی شاعری کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ پہلے اس تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے جس میں اس زبان اور اس کی

شاعری نے جنم لیا ہے۔"

وزیر آغا نے تاریخ اور تہذیب کی سطح پر برصغیر میں پروان چڑھنے والی شاعری کی تین اصناف، گیت، غزل اور نظم کا تجزیہ پیش کیا اور نئے نتائج اخذ کیے۔ لیکن انہیں شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ اختلاف کی اس دل دوز داستان کو اس کتاب میں وزیر آغا نے خنک مزاجی سے پیش کیا ہے اور اس تنگ نظری کو بھی آشکار کیا ہے جو ہمارے ادبی اور علمی حلقوں میں پروان چڑھ چکی ہے۔

"شام کی منڈیر" کا دوسرا حصہ 1986ء سے 2009ء تک کی فکری داستان ہے۔ اس دوران میں وزیر آغا گاؤں چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور میں آباد ہو چکے تھے۔ اس دور میں ہی انہیں تین یا چار مرتبہ بھارت کی راجدھانی دہلی جانے اور ایلورا اور اجنتا کے ثقافتی آثار دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ایک طویل سفر لندن کا اختیار کیا۔ اس حصے میں دونوں ملکوں کے ادیبوں کے ساتھ ملاقاتیں اور مختلف موضوعات پر مباحث بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ دوستوں کے ایک وسیع حلقے سے محو کلام ہیں، نئے دوستوں کا یہ حلقہ لاہور میں بھی قائم ہے اور شہر سے دور چھاؤنی میں وہ شام دوستاں بھی آباد نظر آتی ہیں جو کبھی سرگودھا میں قائم تھی۔ وزیر آغا اب اپنی عمر عزیز کے 86ء برس گزار چکے ہیں۔ انہیں اپنے داماد وار حسین اور اپنی بیگم کی وفات کے سانحات کے علاوہ خود بھی ایک حادثے کا سامنا کرنا پڑا جس میں ان کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن "شام کی منڈیر سے" ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی ایک زندہ دل انسان کی طرح اپنے افکار کی روشنی میں بسر کی اور اپنی رجائیت کو ہمیشہ قائم رکھا۔ ڈاکٹر پرویز پروازی نے درست لکھا ہے کہ

> "شام کی منڈیر سے" دوسری خودنوشتوں سے ممتاز ہے اور یہ ایک ایسے شخص کی خودنوشت ہے جس نے تنقید کو نیا لب ولہجہ دیا۔ انشائیہ کو نیا ڈھنگ اور اپنی کہانی کو اظہار کا نیا آہنگ دیا اور خود کسی چیز کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا۔۔۔ اسے جتنا متنازع بنانے کی کوشش کی گئی وہ اتنا ہی ابھر کر، نکھر کر، سامنے آیا۔"

نقّاد ڈاکٹر پرویز پروازی کے نام

سول لائنز۔ سرگودھا، پاکستان

15 ستمبر 1992ء

برادرم پرویز پروازی السلام علیکم

ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ امید ہے کہ اس دوران میں آپ کو میرا خط بھی مل گیا ہوگا۔ میں نے آپ کی خیریت ڈاکٹر منیر ڈی احمد سے بھی دریافت کی تھی۔ آج ہی ان کا خط آیا ہے کہ آپ اب روبصحت ہیں۔ مگر اطمینان تو آپ کا خط پا کر ہوا ہے۔ خدا کرے اب آپ جلد از جلد پوری طرح سے ٹھیک ہو جائیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب کوئی بحرانی صورت پیش آتی ہے تو انسان کو رشتوں کی صحیح نوعیت کا علم ہوتا ہے۔ آپ بیمار ہوئے تو مجھے معلوم ہوا کہ آپ مجھے کتنے عزیز ہیں۔ نجانے آپ سے کب ملاقات ہو گی۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ پاکستان نہیں آئیں گے یا کم از کم ایک طویل عرصے تک نہیں آئیں گے۔ سو یہی صورت ہو سکتی ہے کہ اگلے موسم سرما میں یورپ آنے کا پروگرام بناؤں، تاکہ آپ سے مل سکوں۔

میں پوری کوشش کروں گا کہ 5 اکتوبر کو آپ کی بیٹی کی شادی میں شرکت کروں۔ مگر کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ بیٹی کی شادی میں آپ شریک نہیں ہو رہے۔

بہت خوشی ہوئی کے ڈاکٹر مارگریتا پیٹرسن میری بعض نظموں کا سویڈش میں ترجمہ کر رہی ہیں۔
میں اس خط کے ساتھ آپ کو اپنی کتاب A Tale so Strange بھیج رہا ہوں جو میری طویل نظم ''اک انوکھی'' کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ترجمہ میں نے خود کیا ہے۔ اس نظم کا موضوع آج کی داخلی اور خارجی

Pollution ہے۔ میری یہ فرمائش ہے کہ مارگریتا پیٹرسن میری اس نظم کا ترجمہ (سویڈش) میں کریں۔ اور پھر اسے کسی اہم سویڈش جریدے میں چھپوائیں۔ مشرق میں اس موضوع پر یہ پہلی طویل نظم ہے۔ ممکن ہے کہ مغرب میں بھی اسے اولیت حاصل ہو۔ مگر میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کتاب کے ملنے کی مجھے اطلاع دیں اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات بھی لکھیں۔

والسلام

آپ کا

وزیر آغا

انشائیہ نگار پروفیسر جمیل آزاد کے نام

ماہنامہ ''اوراق'' ۔ لاہور

10 نومبر 1998ء

برادرم جمیل آزاد السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ ساتھ ہی ''جھاڑیاں اور جگنو'' پر آپ کا تبصرہ بھی۔ تبصرہ خوب ہے۔ آپ نے اس میں بڑے کام کی باتیں کہی ہیں اور انشائیہ کے مزاج کو بھی خوبی سے پیش کر دیا ہے۔ ایک آدھ انشائیہ کا اقتباس حذف کیا ہے۔ باقی سارا مضمون ''اوراق'' کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔

''پوئٹری اوراق'' سوم (Poetry Auraq 3) کے کچھ نسخے آپ کے پاس ہیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ انگریزی اخبارات میں ان پر تبصرے شائع ہوں گے۔ مگر تا حال کوئی تبصرہ سامنے نہیں آیا۔ کرنل صاحب نے بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ آپ کی معرفت انہیں بھی ''پوئٹری اوراق'' سوم کا ایک نسخہ بھیجا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے لکھیے گا۔ میری نظموں کے انگریزی تراجم پر مشتمل ایک کتاب اب پریس میں ہے۔ امید ہے کہ نومبر 1998ء میں شائع ہو جائے گی۔ حسب معمول۔ حسب سابق۔

ایک طویل مدت کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی۔ دل خوش ہو گیا۔ آپ پہلے کی طرح ہشاش بشاش تھے۔ آپ کی ذہنی اور جسمانی صحت کا راز اس میں ہے کہ آپ ہر بات میں اغماض و درگزر سے کام لیتے ہیں اور انتقامی رویے کو قریب بھی نہیں آنے دیتے۔ یہی اصل بات ہے کہ انسان چھوٹے چھوٹے معاملات سے اٹھ کر آگے بڑھے۔ آج صورت یہ ہے کہ لوگ نارمل نہیں رہے۔ بالکل معمولی سی بات پر بھی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ بہت Touchy ہو گئے ہیں۔ اللہ اپنا رحم کرے۔

والسلام

آپ کا وزیر آغا

شاعر صبا اکرام کے نام

''اوراق'' ۔ لاہور

18 اپریل 1997ء

برادرم صبا اکرام السلام علیکم

آج عید ہے اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں ۔ عید مبارک!

آپ کا خط مل گیا ہے ۔ خوشی یہ ہوئی کہ آپ کو کتاب اچھی لگی ۔ اگر آپ کے نام کی گئی ہے تو یہ آپ کا حق تھا ۔ آپ میرے چند عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں ۔ خدا آپ کو خوش رکھے ۔

میں ہر سال لاہور جاتا ہوں مگر اس بار ''فلو'' کا ایسا حملہ ہوا کہ مہینہ بھر پڑا رہا ۔ توقع ہے کہ اب 21 اپریل کو جاؤں گا ۔ میری نظموں کا مجموعہ ''عجب اک مسکراہٹ'' کا مسودہ تیار ہے ۔ اسے پریس کے حوالے کرنا ہے ۔ توقع ہے کہ کتاب مئی کے پہلے ہفتے میں شائع ہو جائے گی ۔ آپ کو بھیجوں گا ۔

چند روز ہوئے مدراس سے انگریزی کے مشہور لکھک جناب بی کاویری کا ایک ریویو A Tale so Strange پر موصول ہوا ۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اسے جلد ہی وہاں کے کسی انگریزی اخبار میں شائع کرائیں گے ۔ مجھے انہوں نے اجازت دی ہے کہ پاکستان کے کسی انگریزی اخبار میں شائع کرادوں ۔ سو آپ کو بھیج رہا ہوں ۔ اسے پڑھیں اور پھر چھاپ بھی دیں ۔ میں اس کا ایک تراشہ کاویری صاحب کو بھجوا دوں گا ۔ انہوں نے کمال کا ریویو لکھا ہے ۔ سچی بات یہ ہے کہ اسے پڑھ کر میں حیران رہ گیا ۔ کیا واقعی یہ نظم اس پائے کی ہے؟ امریکہ سے الیگزینڈر ریسٹر کا خط بھی ملا ہے ۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ نظم دنیا کے بہترین ادب میں شامل کی جانے کے قابل ہے ۔ اگر یہ بات ہے تو پھر یہ اعزاز اردو زبان کا ہے کہ وہ دنیا کے

بہترین لٹریچر میں شامل ہونے پر قادر ہے۔

ڈاکٹر پرویز پروازی کی کتاب پر دونوں "ریویوز" مل گئے ہیں۔ بے حد ممنون ہوں۔ آج میں انہیں بھجوا رہا ہوں۔ اس خط کے ملنے کی اطلاع ضرور دیں۔

A Tale so Strange اور اس کا ترجمہ سویڈش زبان میں کتابی صورت میں سویڈن کے ایک پبلشنگ ہاؤس نے چھاپا ہے۔ کیا میں نے اس کتاب کا نسخہ آپ کو بھجوایا تھا؟ ازرہ کرم مطلع کریں۔ یہ نظم یونانی زبان میں بھی (کتابی صورت میں) شائع ہو چکی ہے۔ اور اس کے چند نسخے میرے پاس ہیں۔

(نوٹ) اگر ریویو کے ساتھ کوئی نوٹ دینا چاہیں تو اس کتاب کے بارے میں مختلف لوگوں کی آراء بھیج رہا ہوں۔

والسلام

مخلص

وزیر آغا

افسانہ نگار عذرا اصغر کے نام

58 سول لائنز۔ سرگودھا

24 دسمبر 1991ء

محترمہ عذرا اصغر صاحبہ!

السلام علیکم۔ آپ کا خط ملا۔ تہہ دل سے ممنون ہوں۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ اظہر جاوید صاحب پر ایک جامع اور بھرپور مضمون ''تجدیدِ نو'' میں چھاپنا چاہتی ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ایک مضمون کافی نہیں ہے۔ ''تجدیدِ نو'' میں ان کے فن اور شخصیت پر ایک پورا گوشہ شائع ہونا چاہیئے۔ انہوں نے ایک ''تخلیق کار''، ''ایک مدیر'' اور ادبی محفلوں کی روحِ رواں ہونے کی حیثیت میں پچھلے تیس سالوں میں ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف ''تجدیدِ نو'' میں ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں آپ اظہر جاوید صاحب سے کہہ کر ان سے سارا کلام مرتب کرائیں۔ اور اسے کتابی صورت میں شائع کریں۔ یہ کام سب سے پہلے ہونا کہ لکھنے والوں کے لیے آسانی ہو۔ آپ نے چند خوبصورت کتابیں چھاپی ہیں۔ اظہر جاوید کی کتاب بھی آپ کو ہی چھاپنی چاہیئے۔ کتاب آ جائے تو ''تجدیدِ نو'' میں اظہر جاوید کے گوشے کے لیے سب سے پہلے مضمون لکھوں گا کیوں کہ وہ مجھے بے حد عزیز ہے۔

اور اب آپ کی شکایات۔

میں تو سرگودھا میں رہتا ہوں۔ ترسیل کا کام نیاز کے سپرد ہے۔ وہ بے چارہ ہر کام بڑی متعدی سے کرتا ہے مگر کبھی کبھی اس سے کوتاہی بھی ہو جاتی ہے۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ پہلے پرچہ آپ کو

براہ راست جاتا تھا یا بذریعہ منشا یاد صاحب۔ اگر براہ راست جاتا تھا تو اس بات کا امکان ہے کہ نئی اعزازی فہرست مرتب کرتے ہوئے آپ کا نام اس سے ''سہوا'' رہ گیا ہو۔ بہرحال میں نے اسے خط لکھ دیا ہے۔ پرچہ چند روز میں آپ کو مل جائے گا۔

آپ کی دوسری شکایت جونیرز (Joniours) میں اپنے نام کی شمولیت کے بارے میں ہے۔ میں نے ابھی ابھی پرچہ منگوا کر دیکھا ہے۔ اس میں آپ سے پہلے جو نام چھپے ہیں مثلاً انور خواجہ، شمس نغمان، محمود شکیل اور نجم الحسن رضوی یہ سب بہت سینئر لکھنے والے ہیں اور 1960ء سے لکھ رہے ہیں۔ میں جلد ہی ڈاکٹر انور سدید سے پوچھوں گا تا کہ اگر غلطی ہوئی ہے تو آئندہ نہ ہو۔ ''اوراق'' کے لیے افسانہ ضرور بھیجیں۔

''تجدید نو'' جس میں شمس آغا کا گوشہ شامل ہے، مجھے مل گیا ہے۔ بہت خوشی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی مجھے کچھ سنجیدہ قسم کی شکایات بھی ہیں مگر یہ ایسے مسائل ہیں کہ ملاقات کے موقعہ پر کچھ عرض کروں گا۔ فی الحال صرف یہ کہ بہت سا غلط اور دل دکھا دینے والا مواد شائع ہوا ہے۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں۔ اصغر صاحب کو میرا اسلام کہیئے۔

مخلص

وزیر آغا

انور سدید کے نام

وزیر کوٹ۔ سرگودھا

5 اگست 1975ء

برادرم انور سدید صاحب السلام علیکم

میں نے آپ کے تھیسس کا پہلا باب پڑھ لیا ہے۔ مگر میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ جب میں نے اپنا تھیسس لکھنا شروع کیا تھا تو یقین جانیئے کے پہلے باب کے سلسلے میں، سال بھر میں، ایک سو کتابوں کا مطالعہ میں نے کیا۔ جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ موضوع میری گرفت میں آ گیا ہے تو پھر میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ سو آپ بھی تحریک اور تحریک کے پس منظر پر جم کر لکھیں۔ آپ کے تھیسس کا یہ پہلا باب ہے۔ اس میں جو بنیادی نکات آپ پیش کریں گے، پورے تھیسس کی بنیاد اسی پر استوار ہو گی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ موضوع کے سلسلے میں آپ کا ذہن بالکل صاف ہو۔ میں نے آپ کے ارسال کردہ باب پر جگہ جگہ نشانات لگا دیے ہیں اور حوالے کی کتابوں کے نام بھی لکھ دیے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ایک تفصیلی ملاقات بہت ضروری ہے۔ آپ کسی روز دفتر سے چھٹی کریں اور یہاں آ جائیں۔ اگر مجھے آپ کے یہاں آنے کی تاریخ اور وقت معلوم ہو جائے تو پھر میں نہر کے پل پر تانگہ بھیج دوں گا۔

خدارا! یہ نہ سوچیے کہ میں میاں میر کے پل پر آپ کیلیے تانگہ کا انتظام کر دوں گا۔ میں تو وزیر کوٹ کے پاس سے گزرنے والی نہر لوئر جہلم کی لالیاں برانچ کے پل کا ذکر کر رہا ہوں اور یہ اس لیے کہ میں اب وزیر کوٹ آ گیا ہوں۔ پچھلی ملاقات کے دوران میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم لوگ اب لاہور چھوڑ کر واپس گاؤں چلے جائیں گے۔ سو اب اس پروگرام کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا تھا کہ

نقل مکانی کی وجوہ کیا ہیں اور میں نے کہا تھا۔ پھر بتاؤں گا۔ یہ صرف Suspense پیدا کرنے کے لیے تھا اور کوئی خاص وجوہ تھیں ہی نہیں بس یہ سمجھیے کے طبیعت اکتا گئی، جیب خالی ہوگئی اور وزیر کوٹ کی دھرتی نے ہمیں Reclaim کرلیا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایک بار آپ کو لکھا تھا کہ زمین سے اگر بے نیازی برتیں تو وہ بخیل ہو جاتی ہے۔ میری جنم بھومی میرے لاہور چلے جانے کے باعث نہ صرف بخیل ہوگئی، بلکہ صحیح معنوں میں ناراض بھی ہوگئی۔ چنانچہ کئی فصلیں عناصر کی زد میں آئیں اور پھر کیڑوں کا رزق بن گئیں۔ برے وقت کے لیے جو کچھ جمع کر رکھا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ خرچ ہو گیا۔ جب حالات زیادہ خراب ہونے لگے اور لاہور کے اخراجات کو پورا کرنا مشکل ہو گیا تو میں نے اہل خانہ کی گول میز کانفرنس طلب کی اور انہیں بتایا کہ اگر وہ لاہور سے اپنے بوریا بستر گول نہ کرنے پر اسی طرح بضد رہے تو میں حالات کے مزید خراب ہو جانے کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔ بات کچھ ان کی سمجھ میں بھی آگئی۔ پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ مالک مکان نے نوٹس بھجوادیا کہ مکان خالی کرو۔ میں نے اس نوٹس کا فائدہ اٹھایا۔ دل ہی دل میں مالک مکان کی درازی عمر کے لیے دعا کی۔ منہ زبانی اس کی شان میں کلمات خیر نشر کیے اور پھر ہم لوگ بوریا بستر باندھ کر واپس وزیر کوٹ آگئے۔

جب سے مینا کی شادی ہوئی ہے۔ وہ زیادہ تر اپنے سسرال ہی میں رہتی ہے۔ سلیم اب گورنمنٹ کالج سرگودھا میں تعلیم حاصل کرے گا۔ وہاں برادر خاص غلام جیلانی اصغر کی مملکت خداداد چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ لہٰذا امید ہے کہ وہ سلیم کا خاص خیال رکھیں گے اور اپنا علم جس پر وہ مار سیاہ کی طرح کنڈلی مارے ایک زمانے سے بیٹھے ہیں، سلیم تک منتقل کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ تاکہ ان کا نام بلند ہو ان کی شہرت دور دور تک پہنچے۔ بہر حال وزیر کوٹ کی جنت گم گشتہ تو دوبارہ مل گئی ہے۔ مگر المیہ دیکھئے کہ آدم اور حوا پھر سے اکیلے ہو گئے ہیں۔

سو بھائی صاحب اب میں وزیر کوٹ کا باسی ہوں۔ میں اب اس ارادے کے ساتھ یہاں آتا ہوں کہ باقی زندگی یہیں بسر کروں گا۔ حویلی کی دیواروں پر سفیدی کرائی ہے۔ بیوی برسوں کے کوڑا کرکٹ کو ٹھکانے لگانے میں مصروف ہے اور میں ایک عرصے بعد درختوں، پرندوں اور کسانوں سے صحیح معنوں میں معانقہ کر رہا ہوں۔ لاہور کے قیام کے دوران جب کبھی یہاں آکر چند روز کے لیے ٹھہرتا تھا تو

سب لوگ مجھ سے دور دور ہی رہتے تھے کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ میں ایک مہاجر پرندہ ہوں۔ چند روز میں اڑ جاؤں گا۔ مگر اب انہیں معلوم ہے کہ میں ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہنے آیا ہوں۔ سو وہ سب خوش ہیں اور میری خوشی؟۔۔۔ مجھے ویسی ہی خوشی ملی ہے جیسی بچپن میں گرمیوں کی چھٹیوں کے موقع پر ملا کرتی تھی۔

آپ کا

وزیر آغا

اقبالؒ وزیر آغا کی نظر میں

سوالات: سعدیہ ارشد

جوابات: انور سدید

سعدیہ ارشد: ''ڈاکٹر وزیر آغا اپنی زندگی میں افکار اقبالؒ سے کس حد تک وابستہ تھے؟''

انور سدید: ''علامہ اقبالؒ سے ڈاکٹر وزیر آغا کی وابستگی تو ان کے طالب علمی کے زمانے میں ہی قائم ہو گئی تھی۔ اقبالؒ کی نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' ان کے سکول میں ہر روز درس و تدریس کے آغاز سے پہلے سب طلبا مل کر پڑھتے تھے۔ اس نظم کے سب اشعار وزیر آغا کو زبانی یاد تھے۔ وہ اقبالؒ کی صد سالہ برسی پر اپنی کتاب ''تصورات عشق و خرد۔۔۔ اقبالؒ کی نظر میں'' لکھ رہے تھے تو ایک شام کی محفل میں سجاد نقوی صاحب نے ان سے پوچھا '' آپ کو اپنے بچپن میں اقبال کی کون سی نظم سب سے زیادہ پسند تھی؟'' انہوں نے بتایا کہ

> سکول کے سب بچے ''لب پہ آتی ہے دعا۔۔۔'' کو پسند کرتے تھے لیکن مجھے ''پرندے کی فریاد'' زیادہ اچھی لگتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں گزرے ہوئے دنوں کو قیدی پرندے نے باغ کی بہاروں میں اپنے چہچہانے سے یاد کیا تھا اور ہمیں بھی ہر روز سکول میں غیر حاضری قید سے کم نہیں لگتی تھی اور سکول سے چھٹی کے بعد گاؤں کی آزاد فضا بڑی مسرت افزا محسوس ہوتی تھی۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وزیر آغا کو جہاں بچپن میں محرم کی مجالس میں میر انیس اور مرزا دبیر سے وابستگی پیدا ہوئی وہاں سکول کے زمانے میں ہی وہ کلام اقبالؒ سے بھی ربط و تعلق پیدا کر چکے تھے اور اس کے بعد اقبالؒ ان کے مطالعے کا حصہ رہا۔

یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ایک ادیب، شاعر، نقاد اور انشائیہ نگار کی حیثیت میں رونما ہوئے تو اقبال کو انہوں نے اپنے ادبی کام میں ایک اہم موضوع کی حیثیت دی۔ اس سلسلے میں ان کی پہلی تنقیدی اور تحقیقی کتاب ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ جس میں کتاب کے موضوع کی مناسبت سے انہوں نے اقبالؒ کی ظریفانہ شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی ہے جسے اگر اجتہادی نظر قرار دیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ اقبالؒ سے پہلے اکبر آبادی نے ''اودھ پنچ'' کے دور میں طنز و مزاح کو استبذال سے نکالنے اور معاشرتی ناہمواریوں اور مغربی تہذیب کے منفی اثرات کو نشان زد کرنے کی کاوش کی اور ان کے اس انداز کو ان کے اپنے عہد اور مستقبل دونوں نے قبول کیا۔ اقبالؒ کا شمار بھی ان شعرا میں ہوتا ہے جو اکبر الہ آبادی سے متاثر تھے۔ چنانچہ بعض ناقدین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اقبالؒ کا ظریفانہ کلام اکبر الہ آبادی کی تقلید کا نتیجہ ہے اور جب اقبالؒ کو اس بات کا احساس ہوا تو انہوں نے بلاواسطہ طنز و مزاح سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وزیر آغا کا موقف اس کے برعکس تھا۔ انہوں نے اقبالؒ کی انفرادیت کا اعتراف یوں کیا کہ طنز اقبالؒ کے کلام کا ایک اہم عنصر نظر آنے لگی اور اس سے انہوں نے اپنی سنجیدہ شاعری میں نہ صرف فائدہ اٹھایا بلکہ سنجیدگی اور ظرافت کا امتزاج بھی پیدا کیا جو ہر عظیم شاعر کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ وزیر آغا نے لکھا:

> ''علامہ اقبال کی طنزیہ شاعری میں سنجیدگی اور ظرافت کا یہ امتزاج ان کی فطری متحمل مزاجی اور اعتدال کا غماز ہے۔ پھر ان کے ہاں بالعموم ایک ایسا بالواسطہ انداز موجود ہے جو طنز کی نشتریت تو قائم رہتی ہے لیکن کسی شدید رد عمل کو تحریک نہیں ملتی۔''

(''اردو ادب میں طنز و مزاح''، لاہور اشاعت نہم 1999ء، ص 113)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو کے جدید شعرا کے فن کی مثالی جہت تلاش کرنے کے لیے ایک سلسلہ مضامین تحریر کیا تو اس میں بھی اقبالؒ کو فوقیت دی اور ''اقبالؒ فطرت پرستی کی ایک مثال'' کے عنوان سے

ایک خیال انگیز مقالہ لکھا۔ اس نوع کا ایک اور مضمون کلام اقبالؒ میں ڈرامے کا عنصر" ہے۔ ان دو مضامین میں اقبال کو ان کی شاعری کے داخل سے دریافت کیا گیا ہے۔ اول الذکر مضمون ان کی گرانقدر کتاب "نظم جدید کی کروٹیں" میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ وزیر آغا کی ایک اہم تنقیدی کتاب "اردو شاعری کا مزاج" ہے۔ اس میں اردو شاعری کی تین اصناف غزل، نظم اور گیت کا مزاج متعین کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں غزل اور نظم کے حوالے سے اقبالؒ کی انفرادیت بھی دریافت کی گئی ہے۔ انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی کو غزل کے نئے دور کا نقطہ آغاز تسلیم کیا لیکن اس کے کشادہ افق کی تشکیل کا سہرا اقبالؒ کے سر باندھا اور اقبالؒ کو غزل کا اجتہادی شاعر قرار دیتے ہوئے لکھا:

> "اقبالؒ کے ہاں زندگی کے بہت سے موضوعات اس کی اپنی ذات کی تحریک اور تجسس کی پیداوار تھے۔۔۔ اقبالؒ نے (ان موضوعات) غزل کے لمس سے ایک ایمائی کیفیت عطا کی تو منزل کا ایک نیا اسلوب ابھر آیا ۔۔۔ جدید اردو غزل نے نہ صرف موضوع کے سلسلے میں ۔۔۔ اقبالؒ کی خوشہ چینی کی بلکہ اسلوب کے ضمن میں بھی اقبالؒ ہی سے اکتساب کیا۔"

("اردو شاعری کا مزاج"/ ص252/لاہور2008ء)

اردو نظم کے ارتقا میں وزیر آغا نے نظیر اکبر آبادی، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، برج نرائن چکبست، سورج نرائن مہر، اکبرالہ آبادی، شبلی نعمانی اور تلوک چند محروم کی عطا کو تسلیم کیا ہے لیکن اقبالؒ کے تخلیقی تجربات نے اردو نظم کی نئی راہیں کشادہ کیں۔ نظم کا رخ خارج سے داخل کی طرف کر دیا اور اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں اردو کی رومانوی تحریک کو فروغ ملا تو اس میں اقبالؒ کا اجتہاد شامل تھا۔ ان کی داخلیت کو جدید نظم کا اہم ترین عنصر شمار کیا گیا۔

متذکرہ بالا تفصیل وزیر آغا کی اقبالؒ سے وابستگی کو تو ظاہر کرتی ہے لیکن آپ اسے جستہ جستہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے وزیر آغا نے اقبالؒ پر پوری نظر اپنی کتاب "تصورات عشق و خرد۔۔۔ اقبالؒ کی نظر میں" میں ڈالی ہے۔ وزیر آغا نے اس موضوع کو اقبالؒ کے فکری پس منظر سے ابھارا، ان کے تصورات عشق و خرد کا موازنہ دنیا کے لاتعداد مفکرین کے تصورات سے کیا اور پھر اقبالؒ کی مخصوص علامتوں کی طرف پیش قدمی کر کے اقبال کے مزاج کی اس جہت کو دریافت کیا جو توازن و اعتدال

سے عبارت ہے اور جو جذبے کو پابہ گل ہونے کا سبق دیتی ہے تو خرد کو آتشِ عشق میں کود پڑنے کا حوصلہ بھی عطا کرتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ماضی بعید کے فلاسفر فیثا غورث اور افلاطون کے تصورات سے آغاز کیا گیا ہے اور نٹشے، کانٹ، سپائی نوزا، ڈیوڈ ہیوم اور برگساں جیسے فلاسفروں کو زیر بحث لاتے ہوئے زمانہ حال کے مفکر کولن ولسن تک سب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے تو اس میں اقبالؒ کو مرکزی نقطہ بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب ''اقبال صدی'' پر شائع ہوئی تھی اور 1977ء سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن پاکستان و ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں اور اسے اقبالؒ پر ایک بے مثال کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔ اقبالؒ اور وزیر آغا کے درمیان محبت اور موانست کو جو رشتہ موجود تھا، یہ کتاب اس کا ایک اہم زاویہ ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ مطالعہ اقبالؒ وزیر آغا کے ہاں عشق میں تبدیل ہو چکا تھا۔

سعدیہ ارشد: ''اقبالؒ پر ان کی تحریروں کا منفرد پہلو کیا ہے؟''

انور سدید: ''مطالعہ اقبالؒ میں وزیر آغا کا منفرد پہلو یہ ہے کہ اوائل حیات میں انہیں اقبالؒ کی موسیقی ریز نظموں میں دلچسپی پیدا ہوئی لیکن ان کے مطالب و معانی اس ابتدائی دور میں ان کی فہم و فراست سے بلند تھے۔ شعور کی بیداری پر جب اقبالؒ کی نظموں کے معانی کھلنے لگے تو انہیں اقبال کی شاعری نے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس زمانے کے بیشتر نقاد اقبالؒ کے الفاظ و معانی کی وضاحت میں کوشاں تھے۔ فلسفہ اقبالؒ کی تشریحات میں بھی دلچسپی لی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر عشرت حسین انور، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، عزیز احمد، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، میر ولی الدین اور متعدد دیگر دانشوروں نے اپنی کتابوں میں اقبالؒ کو متنوع زاویوں سے پیش کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب میں ''اقبالیات'' کو ایک الگ شعبہ علم یا صنف ادب کی حیثیت مل گئی ان سب میں وزیر آغا کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اول اقبالؒ کو ایک شاعر کی حیثیت میں پرکھنے اور اردو شاعری کی دو اصناف نظم اور غزل میں ان کی منفرد عطا کو اپنی تنقیدی بصیرت سے دریافت کیا اور اس تجزیاتی عمل میں نفسیات کی دروں بینی سے زیادہ استفادہ کیا اردو غزل میں ان کی انقلابی جہت کو متعارف کرایا اور نظم میں داخلیت کی طرف ان کے رجحان کو جدید نظم کا ایک اہم زاویہ شمار کیا اور اقبالؒ کو اس کا علمبردار قرار دیا۔ وزیر آغا کی انفرادیت کا ایک زاویہ ان کے مضمون ''کرمکِ ناداں سے کرمکِ شب تاب تک'' سے اس وقت سامنے آیا جب اس مختصر تحریر نے ان کی کتاب ''تصورات عشق وخرد

۔۔۔اقبالؒ کی نظر میں'' کو کروٹ دی۔ اوّل الذکر مضمون نے وزیر آغا کے باطن میں تشنگی کو جنم دیا۔ وہ اس موضوع پر مسلسل سوچتے اور مطالعہ کرتے رہے۔ پھر اظہار کا آتش فشاں جولانی پر آیا تو تمام لاوا اس کتاب میں پھیل گیا۔ یورپی اور اسلامی پس منظر میں اقبالؒ پر یہ ایک منفرد اور بے نظیر تحریر ہے اور'' اقبالیات'' میں ڈاکٹر وزیر آغا کی انفرادیت آئینہ دار ہے۔

سعدیہ ارشد: ''ایک اقبال شناس کی حیثیت سے، ان کو کیا مقام حاصل ہے؟''

انور سدید: بیسویں صدی کے برِ صغیر ہندوستان کے ادب میں علامہ اقبالؒ کی حیثیت ایک مینارہ نور کی ہے جس کی کرنوں کو مختلف اربابِ ادب نے اپنے ذوق و ظرف کے مطابق قبول کیا چنانچہ ''اقبالیات'' کے متنوع گوشوں کی افزائش ہونے لگی او یہ سلسلہ اقبالؒ کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ ان پر پہلی تنقیدی کتاب خواجہ احمد دین نے اقبالؒ کو بتائے بغیر 1924ء میں لکھی تھی لیکن اس کی اشاعت روک دی گئی اور کتاب کا پہلا ایڈیشن مؤلف نے نذرِ آتش کر دیا۔ اقبالؒ پر ''نیرنگ خیال'' نے ایک خاص نمبر ان کی زندگی میں شائع کیا اور پہلا یوم اقبالؒ 9 ستمبر 1932ء کو حیدر آباد دکن میں منایا گیا۔ ایک اور یوم اقبالؒ 1938ء میں لاہور میں برپا کیا گیا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اقبال شناسی کا سلسلہ علامہ اقبالؒ کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا اور شیخ عبدالقادر اور منشی محمد دین فوق نے تو ان پر بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں مضامین بھی لکھے تھے جن کی صدائے بازگشت اب بھی سنی جاتی ہے۔ بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے اقبالؒ کے فکر و فن اور احوال و آثار حیات کے الگ الگ گوشے اپنے لیے مخصوص کر لیے تھے۔ مثلاً جناب محمد عبداللہ قریشی نے حیاتِ اقبالؒ کے گم شدہ گوشوں کو تلاش کرنے میں دلچسپی لی۔ نذیر نیازی نے مجالسِ اقبالؒ سے ان کے ملفوظات جمع کیے۔ یوسف سلیم چشتی نے کلام اقبالؒ کی شرح میں لکھیں۔ خواجہ عبدالوحید اپنے بچپن سے اقبالؒ کے نیاز مند تھے۔ ان سے مل کر آئے تو روداد اپنی ڈائری میں درج کر دیتے۔ یہ ڈائری ''یاد ایام'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اقبالؒ کے فکر و فلسفہ پر کام کرنے والوں کے چند نام میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی ہے۔ ان کی اقبالؒ شناسی کی چند زاویوں کا ذکر میں کر چکا ہوں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اقبالؒ کے فکر و فن کے جو گوشے دریافت کیے وہ دوسرے اقبالؒ شناسوں سے مختلف تھے اور اگر موضوع مماثل ہو جاتا تو وزیر آغا کے نتائج نئے نظر آتے ہیں۔ ان کی کتاب ''تصورات عشق و خرد۔۔۔اقبالؒ کی نظر میں

''ان کی اقبالؒ شناسی کی رفعت وعظمت کی مظہر ہے کہ اس میں اقبالؒ کو مشرق ومغرب کے عظیم فلاسفروں کے افکار کے مقابل رکھ کر پرکھا اور جانچا گیا ہے اور فکر اقبالؒ کی ایک نئی توجیہہ بھی کی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ پر ڈاکٹر وزیر آغا کے متفرق مضامین (بالخصوص کرمکِ ناداں سے کرمکِ شب تاب تک) بھی اہم ہیں لیکن ''تصورات عشق وخرد۔۔۔اقبالؒ کی نظر میں'' ان کی اقبالؒ شناسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور انہیں ''اقبالیات کے ایک اہم دانشور کی حیثیت میں مقام امتیاز عطا کرتی ہے۔ بلاشبہ اقبالؒ شناسی میں ان کا رتبہ بلند ہے۔

آپس کی باتیں

ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر غفور شاہ قاسم ستمبر 2010ء کے پہلے ہفتے میں، جب ڈاکٹر وزیر آغا کا انتقال لاہور میں ہو گیا، اپنے آبائی شہر کندیاں (ضلع میانوالی) گئے ہوئے تھے۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کی رحلت کے سانحے کی خبر نہ ہوئی۔ لاہور واپس آنے پر انہیں یہ افسوس ناک خبر ملی تو وہ تعزیت کے لیے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ اس روز کی ملاقات کا موضوع ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔ غفور شاہ قاسم کہنے لگے کہ وہ جب محترمہ حجاب امتیاز علی پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے تھے تو وزیر آغا صاحب سے معاونت حاصل کرنے اور اپنے موضوع پر تحقیقی مواد کی تلاش میں ان کے دولت خانے پر سرگودھا میں حاضر ہوئے تھے۔ وزیر آغا اپنی لائبریری میں مصروف مطالعہ تھے۔ ملازم نے انہیں اطلاع دی کہ کندیاں سے ایک طالب علم ملاقات کے لیے آیا ہے تو ڈاکٹر صاحب مطالعہ چھوڑ کر لائبریری سے باہر آ گئے۔ غیر متعارف ہونے کے باوجود محبت سے ملے اور پر شفقت انداز میں لائبریری میں لے گئے۔

غفور شاہ قاسم نے سلسلۂ گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''ایک طالب علم کی حیثیت میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کتابیں میں نے پڑھ رکھی تھیں، ''اردو ادب میں طنز و مزاح''، ''نظم جدید کی کروٹیں''، ''تنقید اور احتساب'' اور ''نئے تناظر'' جیسی کتابوں سے میں نے ایم اے کی تیاری کے دوران بیش قیمت استفادہ کیا تھا۔ ''اردو شاعری کا مزاج'' سے تو میں بالخصوص متاثر تھا۔ میرے ذہن میں ان کی عالمانہ شخصیت کی ایک تصویر بھی بنتی چلی گئی تھی۔ لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے سادہ وضع کے ایک عام انسان نظر

آئے۔ ان کی لائبریری میں الماریوں میں سجی ہوئی کتابوں نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمرے میں داخل ہو کر مجھے صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی اور خود اپنی میز کی عقب پر رکھی کرسی کے سامنے کھڑے رہے۔ میں بیٹھ گیا تو ڈاکٹر صاحب بھی نشست نشین ہو گئے۔ ان کے وقت کو قیمتی سمجھتے ہوئے میں حرف مطلب فوراً زبان پر لے آیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب بولے" پہلے چائے پی لیجئے، پھر اطمینان سے باتیں کریں گے" اسی وقت ان کا ملازم چائے اور لوازمات سے سجی ہوئی ٹرالی لے کر کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے چائے خود بنائی اور کرسی سے اٹھ کر پیالی میری طرف بڑھا کر کہا" اب چینی اپنی مرضی کے مطابق ڈال لیجئے" ڈاکٹر صاحب نے ٹرالی سے چینی دان اٹھا کر میری سامنے رکھ دیا۔ ایک مضافاتی طالب علم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا یہ پرشفقت سلوک میرے لیے حیران کن تھا۔ پھر حجاب امتیاز علی اور اردو افسانے کا ذکر چھڑا تو گویا ایک دبستان کھل گیا۔ میرے سوالات کا مدلل جواب دے کر ڈاکٹر صاحب نے معلومات کا ذخیرہ مجھے منتقل کر دیا۔ اجازت لے کر اٹھنے لگا تو بولے" اس لائبریری سے جس کتاب کی ضرورت ہو بے تکلف لے جائیں۔"

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم ڈاکٹر وزیر آغا سے اپنی اس پہلی اور آخری ملاقات کا ذکر کر چکے تو افسوس کرنے لگے کہ اس کے بعد ایک دور افتادہ مقام پر تبادلہ کی وجہ سے وہ پھر ان سے مل نہ سکے لیکن وزیر آغا ان کے مطالعے میں ہمیشہ شامل رہے۔ مجھے مخاطب کر کے بولے۔

"انور سدید صاحب! یہ تو سب کو معلوم ہے کہ آپ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہم وطن ہیں اور آپ کا تعلق بھی سرگودہا سے ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کا تعلق آغا صاحب سے کس طرح پیدا ہوا اور پھر یہ رشتہ محبت کیوں کر مضبوط ہوتا چلا گیا۔ اب آغا صاحب اس دنیا سے رحلت فرما گئے ہیں تو ان سے اپنے رابطے پر کچھ روشنی ڈالیے۔" ان کی تلاش کے بارے میں کچھ بتائیے۔"

میں اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ قدرے ٹھہر کر کہا" ڈاکٹر غفور شاہ قاسم صاحب! آپ نے درست کہا ہے کہ وزیر آغا صاحب اور میرا وطن سرگودھا ہے لیکن ہمیں 1964ء تک ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ چک 56، جنوبی جوان کے دادا آغا وزیر خان کے نام پر وزیر کوٹ سے موسوم ہوتا تھا، کے باسی تھے اور میں بلاک نمبر 16 سرگودھا میں رہتا تھا۔ وزیر آغا مجھ سے چھ سال بڑے تھے۔ میں گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا میں داخل ہوا تو وہ 1937ء میں اس سکول سے میٹرک پاس کر کے جھنگ جا چکے تھے۔ اس کالج

سے انہوں نے ایف اے کیا۔ دو اساتذہ معراج الدین اور ضیاء الحق سے ادب کی تعلیم اور ذوق حاصل کیا ۔اور مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں چلے گئے، جہاں ایم اے تک اقتصادیات کے مضمون میں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے پہلے اپنے والد آغا وسعت علی خان کے گھوڑوں کے کاروبار کی وراثت سنبھالی اور پھر اس کاروبار کو اپنے مزاج کے مطابق نہ پا کر کاشتکاری کی طرف آ گئے۔ یہ تمام عرصہ انہوں نے اپنے گاؤں وزیر کوٹ میں گزارا۔ ان کا گھوڑوں کا ایک اصطبل سرگودھا میں بھی تھا اور وہ شہر ضرور آتے ہوں گے لیکن اس زمانے میں لوگ وزیر آغا کی بہ نسبت ان کے والد آغا وسعت علی خان سے زیادہ واقف تھے۔ جو گاؤں سے اپنے دو گھوڑوں کی ٹم ٹم پر شہر آتے اور کچہری بازار سے گزرتے تو لوگ احترام سے کھڑے ہو جاتے۔ بڑے آغا صاحب اور ان کی ٹم ٹم کو میں نے بھی بچپن میں دیکھا تھا۔ لیکن چھٹی جماعت پاس کرنے کے بعد میں ڈیرہ غازی خان اپنے بڑے بھائی میاں فیروز الدین تور کے پاس چلا گیا تھا جو محکمہ زراعت میں ہیڈ کلرک تھے۔ میں نے اپر مڈل کا امتحان ڈیرہ غازی خان سے اور میٹرک 1944ء میں سرگودھا سے کیا۔ دو سال اسلامیہ کالج لاہور میں صرف کرنے کے بعد میں عملی زندگی میں داخل ہونے کے لیے انجینئرنگ سکول رسول چلا گیا۔ میری ملازمت کا دور میانوالی سے شروع ہوا۔ سیالکوٹ، وارسک اور بیدیاں (لاہور) میں سب انجینئر اور ایس ڈی او کی خدمات محکمہ آبپاشی میں انجام دیں۔ 1964ء میں میرا تبادلہ سرگودھا ہو گیا تو ڈاکٹر وزیر آغا سے میری پہلی ملاقات سجاد نقوی صاحب کی وساطت سے ہوئی جو گورنمنٹ کالج سرگودھا سے وابستہ تھے اور انور گوئندی کی ادارت میں چھپنے والے رسالہ ''کامران'' میں ان کی معاونت کرتے تھے۔ میرا ادبی ذوق سکول کے زمانے سے ہی پروان چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ چند اساتذہ نے شاعری اور افسانے کی کتابیں پڑھنے کی چاٹ ڈال دی تھی اور میں خود بھی ٹوٹے پھوٹے بے وزن شعر کہنے اور کہانیاں لکھنے لگا تھا۔ یہ کہانیاں مشہور فلمی رسالہ ''چترا'' اور نیم ادبی رسالہ ''بیسویں صدی'' میں چھپتی تھیں اور اس معیار کے قارئین میں دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا اپنا ادبی ذوق بھی پرورش پا رہا تھا میں ادبی رسائل ساقی، شاہکار، رومان، ادب لطیف، نیرنگ خیال، سویرا اور نقوش پڑھنے لگا۔ وزیر آغا سے پہلی ادبی ملاقات ان رسائل میں ہی ہوئی۔ ''ادبی دنیا'' میں ان کے مضامین نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وزیر آغا کا زمینی تعلق بھی سرگودھا سے ہے تو میری دلچسپی ان میں بڑھ گئی۔ اور میں ''ادبی دنیا'' میں ان کے مضامین، انشائیے، نظمیں اور تجزیاتی مطالعے اور

رغبت سے پڑھنے لگا۔ اس دوران میں انور گوئندی نے مجھے ادب سے غیر حاضر نہ ہونے دیا۔ وہ رسالہ ''ہمایوں'' میں چھپے ہوئے میرے افسانے اپنے رسالہ'' کامران'' میں باقاعدگی سے چھاپتے رہتے تھے۔ اور میں تعطیل پر سرگودھا آتا تو دفتر'' کامران'' میں حاضری ضرور دیتا اور اور ادیبوں سے ملتا تھا۔ سجاد نقوی صاحب سے بھی یہیں ملاقات ہوئی اور بے پایاں خوشی ہوئی کہ وہ اردو کے بے مثل افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی کے چھوٹے بھائی تھے اور وزیر آغا صاحب سے بھی قربت رکھتے تھے۔ میرا اشتیاق دیکھ کر سجاد نقوی بھی اپنے بائیسکل پر بٹھا کر آغا صاحب کے ہاں لے گئے۔ جو گھوڑوں کے اس متروکہ اصطبل میں ایک کھاٹ پر بیٹھے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ نقوی صاحب نے تعارف کرایا تو مجھے حیرت ہوئی وہ'' ہمایوں'' اور'' کامران'' میں میرے افسانے پڑھ چکے تھے اور میرے نام سے بھی واقف تھے۔ یہ پہلی ملاقات آئندہ کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ بعد میں گھوڑوں کا اصطبل ایک شاندار کوٹھی میں تبدیل کر دیا گیا جہاں ہر شام شہر کے ادیبوں میں سے پروفیسر غلام جیلانی اصغر، خورشید رضوی، عصمت علیگ، الطاف مشہدی، انگر سرحدی، عبدالرشید اشک، جوہر نظامی، خنجر بریلوی، انور گوئندی، پرویز بزمی، خلیل بدایونی، سجاد نقوی، پروفیسر رازی تشریف لاتے اور رات گئے تک ادبی محفل برپا رہتی۔ میں ان محفلوں میں جن کے میر مجلس وزیر آغا صاحب ہوتے تھے، اجنبی کی حیثیت میں شامل ہوتا تھا اور ادیبوں کی باتیں حیرت اور استعجاب سے سنتا اور انہیں جذب کرنے کی کوشش کرتا۔ مولانا صلاح الدین احمد کی وفات پر ان کے صاحبزادے نے'' ادبی دنیا'' کی ادارت کے لیے محمد عبداللہ قریشی صاحب کو منتخب کرلیا تو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے طور پر مولانا کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے رسالہ'' اوراق'' جاری کر دیا اور مجھے بھی اس رسالے میں تنقیدی مضامین لکھنے میں تربیت دی۔ انہوں نے ہی میرے باطن سے انشائیہ نگار اور شاعر کو بازیافت کیا۔ پہلے ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا اور ادبی راہنمائی کی۔ اتفاق سے مجھے اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں 1964ء سے لے کر 1980ء تک سرگودھا میں قیام کا موقع مل گیا۔ اس عرصے میں رسمی تعلقات مضبوط ہوتے چلے گئے اور محبت کی چاشنی بڑھتی گئی۔

1980ء میں میرا تبادلہ سرگودھا سے کوٹ ادو میں ہو گیا۔ تین سال کے بعد میں پہلے سرگودھا آیا اور پھر سرکاری ملازمت سے 1988ء میں ریٹائرمنٹ تک لاہور میں قیام کیا۔ لاہور کی مقناطیسی کشش نے مجھے اپنے ساتھ مستقل طور پر وابستہ کرلیا تو میں نے صحافت کا پیشہ اختیار کرلیا۔ تاہم وزیر آغا صاحب

کے ساتھ میرا رابطہ خط و کتابت اور ٹیلیفون کے علاوہ سرگودھا کے دوروں کی وجہ سے بھی قائم رہا۔ اس تمام عرصے میں آغا صاحب نے میرے ادبی کیریر کو شاندار بنانے میں ایک راہنما کا کردار ادا کیا۔ میری ابتدائی کتابیں "فکر و خیال"، "اختلافات"، "غالب کے نئے خطوط"، "کھردرے مضامین" اور "ذکر اسی پری وش کا" وغیرہ مکتبہ اردو زبان سے شائع کیں۔ مجھے پہلے ماہنامہ "اردو زبان" کا پس پردہ مدیر بنایا اور پھر "اوراق" کی ادارت میں شامل کیا۔ ان کے ساتھ دہلی، اورنگ آباد اور مالیگاؤں کے ادبی سیمیناروں میں شرکت کی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب خود بھی لاہور منتقل ہو گئے۔ اور یہاں پر ایک نئی محفل دوستاں آباد ہونے لگی جس میں شاہد شیدائی، صوفی نیاز احمد، شناور اسحاق، ناصر عباس نیر، اقتدار جاوید، سجاد نقوی اور متعدد دوسرے ادیب جب چاہتے شریک ہو جاتے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ میں نے "وزیر آغا ایک مطالعہ" اور "شام کا سورج" کے نام سے دو کتابیں تالیف کیں۔ "وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام" کتابی صورت میں پیش کیے اور ان کے اخباری انٹرویوز کا ایک مجموعہ "مکالمات" کے عنوان سے مرتب کیا۔ 2008ء میں مجھے شیاٹیکا درلاحق ہو گیا تو سرور روڈ پر آغا صاحب کے دولت کدے تک پہنچنا ممکن نہ رہا لیکن ٹیلیفون پر روزانہ طویل تبادلہ خیالات ہوتا اور یہ سلسلہ 31 اگست 2010ء تک یعنی ان کے ہسپتال میں داخل ہونے تک جاری رہا۔ افسوس کہ ادب کی یہ عظیم شخصیت جس کے تمام انداز خردمندانہ اور دانشورانہ تھے 7 ستمبر 2010ء کی شب اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اور اب یہ ناچیز انور سدید ایک مبرم غم میں مبتلا اور شدید تنہائی کا شکار ہے۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم صاحب آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے کچھ وقت آغا صاحب کے ساتھ غائبانہ طور پر گزارنے کا موقع دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

ایک سال ڈاکٹر وزیر آغا کی معیت میں

نصف صدی سے زیادہ عرصہ پہلے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی ایک نظم ''پرانی بات'' میں کہا تھا:

مجھے دُور جانا ہے میں جا رہا ہوں

میں نے یہ نظم پڑھی تو ان کی ''دور کی منزل'' کو زمینی سفر سے تعبیر کیا۔ لمحوں کی گردش میں یہ ایسا سفر ہے جس پر ہم سب رواں ہیں۔ لیکن 7 ستمبر 2010ء کی شب جب گھڑیال نے نئے دن کے طلوع ہونے کی نوید سے پہلے یہ خبر دی کہ اردو ادب کو فکری روشنیوں سے منور کرنے والے دانشور، شاعر، انشائیہ نگار، نقاد اور رسالہ ''اوراق'' کے مدیر ڈاکٹر وزیر آغا اس مادی دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئے ہیں تو اس نظم کے معنی تبدیل ہو گئے اور ''زمینی سفر'' اب ''روحانی سفر'' بن گیا۔ 8 ستمبر 2010ء کی شام کو انہیں ان کے آبائی گاؤں وزیر کوٹ میں لحد نشین کر دیا گیا تو یہ حقیقت سب پر عیاں تھی کہ

موت سے کس کو رستگاری ہے

لیکن اب جب انہیں اس دنیا سے گزرے ایک سال ہو گیا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام سال اردو دنیا نے ان کی معیت میں گزارا ہے۔ اور ڈاکٹر وزیر آغا شاید اردو کے واحد ادیب ہیں جنہیں اخبارات، جرائد، ادبی مجالس اور نجی محفلوں میں بہت یاد کیا جاتا رہا اور ادب کے اس خیر کثیر کا تذکرہ ہوتا رہا، جس کی تقسیم کبیر انہوں نے عمر بھر کی تھی۔ میں آج کی اس مجلس میں ''ذکرِ وزیر آغا'' کے ایک سال کا اجمال پیش کرنے کا آرزومند ہوں۔

اس ضمن میں میں سب سے پہلے الیکٹرانک میڈیا کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے نمائندے

وزیر آغا کے دور افتادہ گاؤں وزیر کوٹ میں پہنچے اور ان کی آخری رسومات کی فلم بندی کرنے کے علاوہ ڈاکٹر رشید امجد، افتخار عارف، ڈاکٹر انور محمود خالد، علی محمد فرشی، محمد منشا یاد، سلیم آغا قزلباش، وقار النسا آغا، شاہد شیدائی، جلیل عالی اور دیگر ادیبوں کے انٹرویو لینے لگے۔ یہ انٹرویوز اس رات اور اگلے روز مختلف نجی اور سرکاری چینلوں پر دکھائے جاتے رہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات کی خبر 8 ستمبر 2010ء کے اخبارات میں چھپ گئی تھی۔ ''نوائے وقت'' کے ادبی صفحے کے مدیر خالد بہزاد ہاشمی آغا صاحب کی علالت کے دوران سلیم آغا قزلباش سے رابطے میں تھے۔ اور یکم ستمبر 2010ء کے بعد ان کا ''صحت نامہ'' بھی چھاپ رہے تھے۔ 8 ستمبر 2010ء کو خالد بہزاد ہاشمی نے وفات کی خبر کے ساتھ ان کے ادبی کارناموں کی پوری تفصیل پیش کی، لاہور کے اخبارات میں سے ''روزنامہ پاکستان''، ''ایکسپریس''، ''خبریں''، ''دی نیشن''، ''دی نیوز''، ''ڈان''، ''اوصاف''، ''ڈیلی ٹائمز''، ''جناح'' اور متعدد اخبارات نے اس سانحے کو ادبی دنیا کا المناک سانحہ قرار دیا اور وزیر آغا صاحب کے حالات زندگی کے ساتھ ان کی کتابوں اور رسالہ ''اوراق'' کی خدمات کا خصوصی تذکرہ کیا۔

چند روز کے بعد مجھے دوستوں نے لاہور اور پاکستان سے باہر کے اخبارات کے تعزیتی تراشے بھجوانے شروع کیے تو احساس ہوا کہ وزیر آغا کے سانحہ رحلت سے پوری ادبی دنیا سوگوار تھی۔ اس دوران موبائل فون پر تعزیتی پیغامات کا تانتا بندھا رہا جو اردو دنیا کے گوشے گوشے سے آرہے تھے۔ یہ سب پیغامات غم کے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے تھے۔ ہر شخص وزیر آغا کی رحلت کو اپنا ذاتی غم اور ادب کا عظیم ترین اور نا قابل تلافی نقصان تصور کر رہا تھا۔ ہر شخص اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ وزیر آغا نے ان کے باطن سے ایک نئے ادیب کو دریافت کیا۔ اس کی ادبی جہت متعین کی اور اسے رسالہ ''اوراق'' میں پروان چڑھایا تھا۔ منشا یاد، حیدر قریشی اور مسعود انور نے اپنی ویب سائٹس سے وزیر آغا صاحب کی وفات کی خبر پوری دنیا میں پہنچا دی تھی۔ بی بی سی لندن نے 10 ستمبر 2010ء کی شب وزیر آغا پر ایک پروگرام خصوصی طور پر مرتب کر کے براڈ کاسٹ کیا جس میں آغا صاحب کے سفر لندن کی تصویریں بھی دکھائی گئیں۔ دوران کے ایک پرانے انٹرویو کو بھی نشر کیا گیا۔

وزیر آغا کی وفات کی خبروں کے اس سلسلے کے ساتھ ہی ان پر اخبارات کے ہفتہ وار ایڈیشنوں میں تعزیاتی کالموں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اگلے چند ماہ کے دوران جاری رہا۔ ان میں زاہدہ حنا

کا کالم" آغا صاحب! روشنی سفر میں ہے" (ایکسپریس)۔ اکبر حمیدی کا کالم" آہ ڈاکٹر وزیر آغا"
روزنامہ" ہمارا مقصد" دہلی۔ امجد اسلام امجد کا" چشم تماشا ہے" (ایکسپریس)، افتخار نسیم کا" افق نامہ"
(پاکستان نیوز امریکہ)۔ سرفراز سید کا" راوی نامہ" (اوصاف)۔ ناصر زیدی کا" بادِ شمال" (پاکستان)۔
منیر احمد (دی نیشن)۔ شعیب احمد (ڈان)۔ قاضی جاوید (دی نیوز) شاہد بخاری (اخبار جہاں)۔ حماد
غزنوی (دی نیوز)۔ خالد یزدانی (نوائے وقت)۔ رؤف ظفر (جنگ)۔ انور سدید (ندائے ملت)۔
ڈاکٹر امجد پرویز (ڈیلی ٹائمز)۔ شائستہ زریں (فرائیڈے سپیشل)۔ سرور ارمان (آئینہ) پیرزادہ سلمان
(ڈان)۔ شاہد شیدائی (صدائے جمہور) محیط اسمٰعیل (ہم شہری) اور جمیل الدین عالی (جنگ) کے کالم
منفرد نوعیت کے محسوس ہوئے کہ ان میں ہر کالم نگار نے وزیر آغا کی مختلف اصناف ادب کی تحسین اپنے
اپنے انداز میں کی تھی۔ (جگہ کی کمی کی وجہ سے سب کالموں کا ذکر نہیں کیا جا سکا)

اب میں ادبی رسائل کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کے اوراق پر گزشتہ ایک سال کے دوران وزیر
آغا صاحب کے فکر و فن اور شخصیت کا ذکر ہوتا رہا۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت اظہر جاوید کے رسالہ
"تخلیق" اور شاہد علی خان کے رسالہ" الحمراء" کو حاصل ہے۔ رسالہ "تخلیق" نے اکتوبر کے شمارے میں دو
مضامین" آخری دستک" (نجم الحسن رضوی) اور" مجھے دور جانا ہے (انور سدید) کے علاوہ ایک تعزیتی نظم
شائع کی جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے:

جس نے وزیر آغا سے ذوق ادب لیا تابندہ اس کا آج ہے دنیائے فن میں نام

فروری 2011ء کے" تخلیق" میں کامران نذیر نے وزیر آغا کو" پرانا قلعہ" قرار دے کر ان کے
ادبی نوادرات، بازیافت کیے۔ اس تمام عرصے میں وزیر آغا صاحب کا تذکرہ متعدد ادیبوں نے" انجمن
خیال" کے خطوط میں کیا اور اظہر جاوید نے آغا صاحب کی کتابوں سے فکری اقتباسات نمایاں طور پر
چھاپنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ وزیر آغا پر اظہر جاوید کا اپنا مضمون" کاغذی پیرہن" کے" وزیر آغا نمبر" میں
شائع ہوا۔ جس کا عنوان ہے" عظیم قلم کار، بے مثال انسان"۔

جناب شاہد علی خان نے اپنے رسالہ" الحمراء" کے اکتوبر 2010ء کے شمارے میں ایک" گوشہ
وزیر آغا" پیش کیا اور اس میں جمیل آزر (وزیر آغا ایک دبستان)۔ یونس حسن (ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔ ایک
اور روشن چراغ بجھا)۔ جمیل یوسف (رفتید و لے نہ از دل ما) ڈاکٹر حافظ رضوان احمد (شان الحق حقی اور

ڈاکٹر وزیر آغا کا آخری مکالمہ) کے مضامین کے علاوہ ستیہ پال آنند، مشکور حسین یاد اور عبید باز غ امر کی نظمیں بھی شائع کیں۔ راقم انور سدید کا تعزیتی مضمون "سلسلہ آشنائی کا۔۔۔اور غم محرومی جاوید کا" بھی پہلی دفعہ الحمراء میں ہی چھپا۔ شاہد علی خان نے اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب پر جو مضامین آتے رہیں گے ہم انہیں نمایاں طور پر شائع کریں گے۔ چنانچہ نومبر کے شمارے میں سید مشکور حسین یاد (ڈاکٹر وزیر آغا سے آخری ملاقات)۔ شاکر کنڈان (برگد کا پیڑ)۔ سید تحسین گیلانی (چند یادیں)۔ دسمبر 2010ء کے شمارے میں سجاد نقوی (ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن پر ایک کتاب)۔ جنوری 2011ء میں ڈاکٹر خورشید رضوی (وزیر آغا کی یاد میں)۔ فروری میں ڈاکٹر محمد خالد (ڈاکٹر وزیر آغا کا سفر آخرت)۔ جون اور جولائی میں انور سدید (ڈاکٹر وزیر آغا کی سالگرہ)، (ڈاکٹر وزیر آغا کی نظر میں زندگی کا تجربہ) اور ڈاکٹر وزیر آغا (فخر الدین بلے) شائع کیے۔

حیران کن بات یہ تھی کہ وزیر آغا کی وفات کے بعد پہلا "وزیر آغا نمبر" میانوالی جیسے دور افتادہ غیر ادبی شہر سے اردو ادب کی ایک طالبہ ارم ہاشمی نے نائبہ اقبال کی معاونت سے شائع کیا۔ رسالہ "تمام" میں ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر ناصر عباس نیئر، ڈاکٹر عابد سیال، ذوالفقار احسن، شفیق الرحمن الہ آبادی اور انور سدید کے مضامین شامل ہیں۔ سب سے اہم مضمون ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا قرار دیا جا سکتا ہے جس میں سرگودھا کی ان ادبی محفلوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے صدارت کی تھی۔ اس مقالے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن پر ہندو پاک میں لکھے گئے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات اور کتابوں کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ جن کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے۔

مرزا شبیر بھیروی نے بھیرہ (ضلع سرگودھا) سے شائع ہونے والے ادبی جریدہ "نالہ دل" کا "وزیر آغا نمبر" جنوری 2011ء میں پیش کیا اور اس میں رشید امجد، منشا یاد، شاکر کنڈان، جواد حسنین، ثاقبہ رحیم الدین، سلیم آغا قزلباش، انور سدید، فرید اللہ صدیقی، ذوالفقار احسن، یوسف چوہان، عابد خورشید کے مضامین نظم و نثر شائع کیے۔ بھیرہ دینی افکار و نظریات کا منفرد شہر ہے۔ ادبی سطح پر اب اسے رسالہ "نالہ دل" مقام امتیاز پر قائم کر رہا ہے۔ "وزیر آغا نمبر" کی پذیرائی تمام ادبی حلقوں میں ہوئی ہے۔ "نالہ دل" کا یہ خاص نمبر "وزیر آغا شناسی" میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

لاہور سے ڈاکٹر ناصر رانا نے ممتاز ادبی رسالہ "ادب معلی" کی جنوری تا مارچ 2011ء کی

اشاعت کو" ڈاکٹر وزیر آغا نمبر" سے موسوم کیا ہے۔اور سرورق پر وزیر آغا کی ایک نظم شائع کی ہے جس میں ادھ کھلے پھول، ساعت پہ جمی چاپ، ہوا بند مکان اور پہاڑ۔ مردہ لمحات کے استعارے ہیں، جن کی موجودگی میں:

وقت ہو جاتا ہے پھر خاک بسر --- بے آرام
اِک پرندہ جسے اُڑتے چلے جاتا ہے خدا جانے کہاں ---

اور"وقت" وزیر آغا کی اپنی ذات کا استعارہ بن جاتا ہے۔ تیس مضامین میں ادبائے کرام نے وزیر آغا کے فن اور شخصیت کے وہ گوشے پیش کیے ہیں جو ان کے ذاتی مشاہدے میں آئے۔ ممتاز اور معروف لکھنے والوں کے ساتھ مجھے اس نمبر میں نذیر خالد، آغا گل، سلیم الرحمان، اصغر علی بلوچ، حسرت کاسگنجوی، آمنہ مجید، شفیع ہمدم، عطاالرحمان میو، شمیم کوثر کے نئے نام نظر آئے اور انہوں نے وزیر آغا شناسی کے نئے زاویے ابھارے۔ سب سے اہم ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کے نام خطوط کے عکس ہیں جن میں وزیر آغا ایک ادبی ترتیب کار اور ادب ساز کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں۔ ناصر رانا نے وزیر آغا کے چند گروپ فوٹو بھی پیش کیے ہیں جو آغا صاحب کی وفات سے چند روز پہلے انہوں نے اپنے کیمرے سے بنائے تھے۔ ڈاکٹر حسرت نے لکھا ہے کہ" ان کے خطوط اور کبھی کبھی ان کی گفتگو نے میرے شوق اور ولولے کو جوان رکھا۔ میں انہیں جب بھی پڑھتا ہوں ایک نیا جذبہ اور جوش محسوس کرتا ہوں"۔ میرے خیال میں خطوط کا Reduced عکس چھاپنے کی بجائے ان کا متن کتابت میں چھپنا چاہیئے تھا۔ میں نے انہیں محدب شیشے سے پڑھا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کا "اوراق" میں بھی کوئی مضمون نہیں چھپا لیکن خطوط سے آغا صاحب کی حسرت صاحب کے لیے انس، محبت، اور الفت اور حوصلہ افزائی چھلک رہی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ادب اور شخصیت پر" خاص نمبر" پیش کرنے کی بے نظیر مثال شاہد شیدائی کے رسالہ" کاغذی پیرہن" نے قائم کی ہے۔ معروف ادیب عابد خورشید نے اس کے تعارف میں لکھا ہے کہ شاہد شیدائی ایسا سلیقہ مند آدمی ہے کہ آنسوؤں کو بھی سجا دیتا ہے۔۔۔ اگر کسی نے ڈاکٹر وزیر آغا کی کوئی کتاب بھی نہ پڑھی ہو تو محض اس ایک رسالے کے مطالعے کے بعد وہ وزیر آغا کی قریباً ہر کتاب سے واقف ہو سکتا ہے۔ کتابوں کے انتخابات کے علاوہ" کاغذی پیرہن" کے اس شمارے میں وزیر آغا کو یاد کرنے والوں میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر شازیہ امیر، جمال اویسی، ارمان نجمی،

عبدالکریم خالد، طارق حبیب، ڈاکٹر ضیاء الحسن، خالد فتح محمد، شفیع ہمدم، حنیف سرمد، اظہر جاوید، پرویز پروازی، منور عثمانی، اقبال آفاقی اور انور سدید کے علاوہ اردو دنیا کے متعدد ادبائے کرام شامل ہیں اور انٹرویوز، پنجابی ادب، منظوم خراج عقیدت، تجزیاتی مطالعات، یادیں اور تاثرات کے لیے الگ سیکشن بنائے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نمائندہ خاص نمبر اس سے پہلے کسی ادبی شخصیت پر بہت کم چھپا ہے۔ ''نقش زیاں'' میں محترم مدیر نے ایک غلط بات کی تردید کر دی ہے جو قاضی جاوید صاحب کے قلم سے سہواً ٹپک پڑی تھی کہ ''مسرت کی تلاش'' برٹنڈ رسل کی کتاب کا لفظی ترجمہ ہے۔ میں نے دونوں کتابوں کا موازنہ کیا ہے۔ قاضی جاوید صاحب کی بات بالکل بے بنیاد نظر آئی۔ (بعد میں یہ وضاحت ہوگئی کہ دونوں کتاب میں صرف عنوان کی مماثلت کا شائبہ تھا)۔

اب میں ان رسائل کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن میں ڈاکٹر وزیر آغا پر خصوصی گوشے مرتب کیے گئے ہیں۔ ان میں اولیت سلیم احسن کے رسالہ ''اجزاء'' کو حاصل ہے جس کا جولائی تا ستمبر کا شمارہ پریس میں جار ہا تھا کہ وزیر آغا صاحب کی وفات کی خبر آگئی۔ سلیم احسن نے کراچی کے ادیبوں۔۔۔صبا اکرام، عباس رضوی، علی حیدر ملک، ثمیر االطہر، سید کاشف رضا اور عابد عباس کے علاوہ انور سدید کے مضامین حاصل کیے اور ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین ادا کیا تو لکھا:

> ''ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات نے ہمارے شعور کو ایسا دھچکا دیا ہے کہ جو برسوں بلکہ مدتوں غم کے چراغ کو ہمارے دلوں میں روشن رکھے گا اور جب ہم انہیں یاد کریں گے تو ہماری آنکھیں غمناک ہو جایا کریں گی۔''

سلیم احسن نے آغا صاحب کی وفات کے بعد ایسے سناٹے کی کیفیت کا ذکر کیا جو اندر کے خوف اور پست ہمتی کا موجب ہو۔ انجمن ترقی اردو کے رسالہ ''قومی زبان'' میں ''گوشۂ وزیر آغا'' ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے مرتب کیا اور اس میں سحر انصاری، یونس حسن کا اور اپنے تعلق پر مضمون شامل کیا۔ رسالہ ''روشنائی'' کے مدیر احمد زین الدین آغا صاحب کی زندگی میں ان پر ایک ضخیم خاص نمبر پیش کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ لیکن آغا صاحب کی وفات اس منصوبے کی عدم تکمیل کا باعث بن گئی۔ اب انہوں نے اپنا غم وزیر آغا پر ایک دقیع گوشہ چھاپ کر غلط کیا، اس گوشے میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند، عبداللہ جاوید، سجاد نقوی، جمیل آزر، بشیر موجد، ارمان نجمی، اختر احسن، اے خیام، انور سدید، رشید امجد اور شفیق احمد شفیق

کے مضامین شامل ہیں۔ ضخیم خاص نمبر زیر ترتیب ہے۔

جناب صابر ارشاد عثمانی ماہنامہ ''پرواز'' لندن سے شائع کرتے ہیں۔ ''پرواز'' کی جنوری 2011ء کی اشاعت میں ایک خوبصورت گوشہ میں وزیر آغا کے بارے میں مضامین پیش کیے گئے۔ لکھنے والوں میں ڈاکٹر وحید قریشی، مناظر عاشق ہرگانوی، انور سدید، افتخار نسیم اور ساحر شیوی شامل تھے۔ اس گوشے میں آغا صاحب کے چند خطوط بھی شائع کیے گئے جو انہوں نے چند نامور ادیبوں کو لکھے تھے۔ جرمنی سے آغا صاحب کے دیرینہ دوست حیدر قریشی نے اپنے رسالہ ''جدید ادب'' کو ان تمام تحریروں سے مرتّب کیا جو انہیں انٹرنیٹ پر پوری دنیا سے موصول ہوئی تھیں۔ صدر پاکستان آصف علی زرداری، وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف، اور اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین فخر زمان صاحب کے پیغامات میں نے ''ادب جدید'' میں پڑھے۔ تعزیت کرنے والوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سی ایم نعیم، ژرمیلا ڈسیلوا، گلزار، شمیم حنفی، اشعر نجمی، ندا فاضلی اور متعدد دوسرے ادبائے کرام (تعداد 60 سے زیادہ) شامل ہیں۔ ''جدید ادب'' انٹرنیٹ پر بھی جاری کیا گیا ہے۔ بھارت کے نامور شاعر گلزار نے لکھا:

''اردو ادب کا وہ بزرگ چلا گیا جسے میں اپنا سبق دکھایا کرتا تھا۔ استاد کی جگہ خالی ہوگئی۔''

''مقتدرہ قومی زبان'' اسلام آباد کے صدر نشین افتخار عارف ڈاکٹر وزیر آغا کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ ان کی وفات پر وہ وزیر کوٹ آئے تو وزیر آغا کو سفید چادر میں لپٹا ہوا خاموش دیکھ کر اشکبار ہوگئے اور پھر انہیں لمبی چپ لگ گئی۔ افتخار عارف نے وزیر آغا پر پہلا سیمینار اسلام آباد میں منعقد کیا۔ اور اس میں جو مضامین پڑھے گئے انہیں ''اخبار اردو'' کے اکتوبر 2010ء کے شمارے میں شائع کیا گیا۔ ''گوشہ وزیر آغا'' میں ڈاکٹر رشید امجد، کشور ناہید، منشایاد، پروفیسر جلیل عالؔی، ناقب رحیم الدین، آفتاب اقبال شمیم، جمیل آذر، انجم نیازی اور سلیم آغا قزلباش کے مضامین شامل ہیں۔

قائداعظم لائبریری لاہور کے ششماہی ادبی مجلّہ ''مخزن'' میں اس کے مدیر جناب شہزاد احمد نے ''گوشہ وزیر آغا'' شمارہ 21 میں شامل کیا اور اس کے لیے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر پرویز پروازی، سجاد نقوی، جمیل آذر، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم اور انور سدید کے مضامین حاصل کیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک نایاب تحریر ''گوری کے روپ اور بہروپ'' اس وقیع گوشے کا ابتدائیہ ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی نے سویڈش رائٹرز یونین کے صدر پیٹر کرمیؔن کے حوالے سے بتایا ہے کہ انہوں نے وزیر آغا کو

سویڈن میں بلایا گیا تھا۔ یونین کے عشائیہ میں ادب کی نوبیل پرائز کمیٹی کے چیئرمین کے جیل الیپ مارک اس عشائیہ میں سارا وقت وزیر آغا سے باتیں کرتے رہے۔ نوبیل لائبریری میں انہیں بتایا گیا کہ آپ کی کتابیں اس وقت ہماری فہرست میں اول نمبر پر ہیں۔ ڈاکٹر پرویز پروازی نے لکھا ''یہ اشارات ایک خاص سمت میں اشارے کر رہے تھے اور یہ بات میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ وزیر آغا کا نام پچھلے کئی سالوں سے اس انعام کے امیدواروں میں شامل ہے۔'' (مخزن 21۔ ص 134)

علی محمد فرشی صاحب نے رسالہ ''سمبل'' کے سالنامہ 2011ء میں ''گوشہ وزیر آغا'' میں ہندوستان میں وزیر آغا پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے والی خاتون ڈاکٹر شازیہ عمر کے مقالے ''وزیر آغا کا اسلوب نقد'' کے ساتھ ڈاکٹر ناصر عباس نیر، جمیل آذر، ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور ڈاکٹر رشید امجد کے مضامین شائع کیے۔ ستیہ پال آنند کی نظم ''دل تو ایوبی ہوا، آنکھیں ہوئی یعقوبیاں'' اور شہاب صفدر کی نظم ''آخری دستک'' ان کے غم زدہ دل کی آوازیں ہیں اور متاثر کرتی ہیں۔

نصیر احمد ناصر نے رسالہ ''تسطیر'' (جنوری تا جون 2011ء) میں ''گوشہ وزیر آغا'' کو ''لمس رفتہ'' کا عنوان دیا اور اس میں رشید امجد اور انور سدید کے مضامین کے ساتھ اقتدار جاوید کی نظم ''وزیر کوٹ'' اور پروین طاہر کی نظم ''روشنی چلتی رہے گی'' شائع کی۔ اس گوشے کا اہم ترین حصہ نصیر احمد ناصر کے نام ڈاکٹر وزیر آغا کے ذاتی خطوط ہیں جن کا بنیادی موضوع ادب اور نصیر احمد ناصر کی تخلیقات تازہ ہیں، یہ خطوط اس حقیقت کو بھی عیاں کرتے ہیں کہ ادبی اختلاف میں شائستگی ضروری ہوتی ہے۔

جان کاشمیری اور مکنون احمد جان نے سہ ماہی ''قرطاس'' (گوجرانوالہ) میں ڈاکٹر وزیر آغا کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے اپنے ہر شمارے میں وزیر آغا پر مضامین چھاپنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ آغا صاحب کی وفات کے بعد شائع ہونے والے ''قرطاس'' کے شمارے میں غالب عرفان کا گرانقدر تنقیدی مضمون ''وزیر آغا۔۔۔ایک ادیب، ایک شاعر ایک نقاد'' پیش کیا گیا تھا۔ سالنامہ ''قرطاس'' (جنوری تا مارچ) میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری (سری نگر) کا مقالہ ''وزیر آغا کا تنقیدی تناظر'' شامل ہے۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی رائے میں ''ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی شعور میں وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ وہ ادیب یا ادب کا سامنا کرتے ہوئے اپنی شخصیت کی وسعت اور ہمہ گیری کے سحر سے ان کے ستور گوشوں کو آشکار کرتے ہیں۔'' میں یہاں ''قرطاس'' میں جان کاشمیری کے اداریے کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں جو آنسوؤں میں ڈوبا

ہوا ہے اور اس بات کا اثبات کرتا ہے کہ جان کاشمیری صاحب کو انشائیہ کے افق پر ڈاکٹر وزیر آغا نے سجایا تھا اور ان کے فن کی اس جہت کو تابانی عطا کی تھی۔ رسالہ "زرنگار" (فیصل آباد) کے اداریے میں جناب ضیاء الحسن ضیا نے ڈاکٹر وزیر آغا کے معاشرت انسانی رویے کی تحسین کی اور لکھا کہ انہوں نے ایسے ادیبوں کو ابھارا جو فن کی ابتدائی منزل پر تھے۔ اردو ادب کو ایسا بے لوث راہنما شاید لمبے عرصے تک میسر نہ آ سکے"۔ سالنامہ "الاقربا" (اسلام آباد) میں ایک گوشہ رفتگاں ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے قائم کیا گیا۔ اس میں پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور انور سدید کے مضامین وزیر آغا سے ذاتی تعلقات کی داستان بیان کرتے ہیں۔ جیلانی صاحب نے انشائی اسلوب میں یہ مضمون وزیر آغا کی زندگی میں لکھا تھا۔ اس کی بازیافت ان کی وفات کے بعد ہوئی، وزیر آغا پر ذاتی حوالے سے اب تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ان میں جیلانی صاحب کا مضمون بہترین قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ شخصیت کا خاکہ نہیں بلکہ "انشائیہ" ہے۔ جو جملہ ہائے معترضہ کے دائروں سے ابھرتا اور وزیر آغا کا نقش مرتب کر دیتا ہے۔

ہندوستان کے متعدد ادبی رسائل نے آغا صاحب کی رحلت کو ادارتی شذروں میں اردو ادب کا عظیم ترین نقصان قرار دیا۔ اور ان کے فن اور شخصیت پر مضامین چھاپے۔ ان رسائل میں سب رس (حیدر آباد دکن)، کتاب نما (نئی دہلی)، مباحثہ (پٹنہ)، شب خون (الہ آباد)، فنون (اورنگ آباد)، آجکل (دہلی)، نئی کتاب (دہلی)، اردو ادب (دہلی) اور انشاء (کلکتہ) کے نام مجھے یاد آرہے ہیں۔ وزیر آغا کے ادبی گوشوں کا احاطہ کرنے کے لیے عذرا اصغر اور شبہ طراز اپنے رسالے "تجدید نو" کا اور ذوالفقار احسن اپنے رسالہ "اسالیب" کا وزیر آغا نمبر ان کی برسی (7 ستمبر) پر چھاپنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ میری اطلاعات کے مطابق یہ رسائل اب پریس میں ہیں۔ جناب محمد رفیع اظہر نے "وزیر آغا کی تنقیدی جہات" پر اور ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے "آفتابِ ادب۔۔۔ وزیر آغا" کے عنوان سے کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کتاب شاہد شیدائی مرتب کر چکے ہیں جو وزیر آغا کے بارے میں ان کی اپنی تحریروں پر مشتمل ہے۔ "یادنامہ وزیر آغا" راقم انور سدید کی کتاب کا عنوان ہے جو وزیر آغا کی وفات کے بعد ان پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔

اب آخر میں چند ادبی تقریبات کا ذکر جو وزیر آغا کی یاد میں منعقد کی گئی ہیں۔ اسلام آباد میں پہلی تقریب جناب افتخار عارف نے مقتدرہ قومی زبان میں منعقد کی۔ اس کے مقرروں میں ڈاکٹر رشید امجد،

منشایاد، جمیل آزاد، ثاقبہ رحیم الدین، جلیل عالی، انجم نیازی، سلیم آغا قزلباش اور افتخار عارف شامل تھے۔
دوسری تقریب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں جناب فتح محمد ملک اور ڈاکٹر رشید امجد نے آراستہ کی۔
لاہور میں ایک سیمینار قائداعظم لائبریری میں جناب عنایت اللہ نے منعقد کیا۔ اس میں شہزاد احمد، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، شاہد شیدائی، ڈاکٹر ضیاء الحسن، حمیدہ شاہین اور انور سدید نے مضامین پڑھے۔ حلقہ ارباب ذوق کے ''وزیر آغا سیمینار'' کا اہتمام جناب قائم نقوی نے کیا تھا اور اس میں جناب اقتدار جاوید، شناور اسحاق، منظور حسین یاد، حماد نیازی، ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور انور سدید نے مضامین پیش کیے۔ ادارہ ''تجدید نو'' کے پرچم تلے ایک تعزیتی ریفرنس جناب اقتدار جاوید نے اور عذرا اصغر نے الحمراء ہال میں منعقد کیا۔ مہمان مقررین میں شہزاد احمد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محمد خالد، ابرار احمد، ضیا حسین ضیا، شاہد شیدائی، انور سدید اور سلیم آغا قزلباش شامل تھے۔ لاہور آرٹس فورم کی تقریب تعزیت کا اہتمام ماڈل ٹاؤن لائبریری لاہور میں جناب مظفر غفار اور ناصر رانا نے کیا۔ مقررین ڈاکٹر خورشید رضوی، مستنصر حسین تارڑ، انور سدید اور ڈاکٹر نعیم احمد شامل تھے۔ سرگودھا کی مختلف انجمنوں نے یونیورسٹی میں وزیر آغا چیئر قائم کرنے کا اعلان کیا۔ قرارداد منظور کی گئی کہ لاہور اور اسلام آباد میں ایک شاہراہ وزیر آغا کے نام سے موسوم کی جائے۔ ان کا یادگاری ٹکٹ (ڈاک) جاری کیا جائے۔ بیرونی ممالک سے ہندوستان، جرمنی، ناروے، انگلستان، دوبئی، کینیڈا اور امریکہ میں اردو پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں نے ادبی تقریبات منعقد کیں، اوسلو پبلک لائبریری میں منعقد ہونے والی تقریب کی ''ویڈیو رپورٹ'' بھی تیار کی گئی۔ اس تقریب کی رپورٹ ''کاغذی پیرہن'' کے وزیر آغا نمبر میں چھپ چکی ہے۔ اورینٹل کالج لاہور میں وزیر آغا کی یاد میں تعزیتی تقریب ڈاکٹر فخر الحق نوری نے شاندار انداز میں منعقد کی۔ میں نے اس مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے کہ وزیر آغا صاحب کی وفات کے بعد اردو دنیا نے پورا ایک سال آغا صاحب کی معیت میں گزارا ہے۔ یہ اس ایک سال کا اجمال پیش کر دیا ہے۔ ان پر مضامین لکھنے اور رسائل میں گوشے چھاپنے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

بلاشبہ وزیر آغا جسمانی طور پر ہم میں موجود نہیں لیکن ان کا ادبی ورثہ پوری اردو دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اور وہ ہماری ادبی محفلوں میں زندگی کی طرح شامل نظر آتے ہیں۔

میری اپنی حالت یہ ہے کہ جب چاہوں آنکھیں بند کر کے انہیں دیکھ سکتا ہوں۔ ان سے باتیں کر سکتا ہوں۔

صفیہ آغا

اس روز صبح سویرے معمول کے وقت سے بہت پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کا فون آیا تو میرا دل یکدم زور سے دھڑ کا۔ میں نے دریافت کیا" ڈاکٹر صاحب، خیریت ہے؟ کئی دنوں سے ایک شدید کرب انگیز تشویش نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ دوسری طرف، فون پر آغا صاحب کی آواز لرز رہی تھی۔

"بیگم کو گزشتہ رات پھر ہسپتال میں داخل کرادیا ہے۔ انہیں "مصنوعی تنفس" کی مشین لگادی گئی ہے۔ میناان کے پاس ہے، میں پھر ہسپتال جارہا ہوں۔ کسی لمحے، کوئی بری خبر آسکتی ہے!

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا۔

ساڑھے تین سال قبل ایک صبح وزیر آغا کا اسی قسم کا فون لاہور کے ایک ہسپتال سے آیا تو انہوں نے بتایا" بیگم پر کینسر نے حملہ کردیا ہے۔ سرگودھا کے ڈاکٹروں نے فوراً لاہور کے کسی بڑے ہسپتال میں لے جانے کا مشورہ دیا ہے۔" اور پھر رجائیت آمیز آواز میں کہا" ڈاکٹروں نے ساڑھے تین ماہ کی مہلت دی ہے، لیکن یہ بھی کہا ہے کہ اب اس مرض میں نئی ریسرچ ہو چکی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں کئی نئی ادویات ایجاد ہو چکی ہیں۔ مرض کا علاج ہو سکتا ہے اور عمر کا یہ وقفہ لمبا بھی ہو سکتا ہے...... " اور پھر بیگم صفیہ آغا جن کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کی شادی 18 اپریل 1949ء کو ہوئی تھی، جان لیوا مرض کینسر کا مقابلہ کرنے لگیں۔

اس شام میں اور میری اہلیہ ہسپتال میں ان کی عیادت کے لیے گیے تو میری بیوی نے کمرے سے باہر آکر بتایا کہ" مجھے تو ایسا کوئی خطرہ نظر نہیں آیا۔ کوکو جی خوب باتیں کرتی رہیں، گزشتہ ملاقات سے اب تک سب حالات مجھ سے پوچھے اور اپنے بتائے۔ ڈاکٹر نے پتہ نہیں کیوں ڈرادیا ہے؟" لیکن مرض

کی تشخیص درست تھی اور چونکہ جدید ترین علاج بھی شروع ہو چکا تھا، اس لیے ساڑھے تین ماہ کا وقفہ پھیلتے پھیلتے ساڑھے تین سال پر محیط ہو گیا، لیکن کینسر کا کڑیالا سانپ جسم میں پرورش پا رہا تھا۔ بدن کے ایک حصے پر اس کے زہر کا مداوا کیا جاتا تو وہ دوسری جگہ پر حملہ کر دیتا اور آخر 12 اپریل 2004ء کی صبح کو کینسر نے آخری وار کیا اور موت ڈاکٹر وزیر آغا اور محترمہ صفیہ آغا کے 55 برس اور 6 دن کے ازدواجی تعلق کو منقطع کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

صفیہ آغا لاہور میں پیدا ہوئی تھیں، ازدواجی زندگی کا تمام حصہ سرگودھا کے نواحی گاؤں وزیر کوٹ میں گزارا، لیکن عمر کے آخری حصے میں کینسر کا مرض لے کر اپنے آبائی شہر لاہور میں آ گئیں اور یہیں وفات پائی۔ وزیر آغا ان کی ڈولی دوسری مرتبہ 12 اپریل کو لے کر وزیر کوٹ جا رہے تھے، لیکن قفس عنصری سے روح پرواز کر چکی تھی۔ زندگی کی منڈیروں پر شام کی ماتم کناں اداسی پھیل چکی تھی دو ستارے ماند پڑ چکے تھے، دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ اپنے دائمی سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ صفیہ آغا اس وقت اپنی عمر عزیز کے 73 برس گزار چکی تھیں۔

وزیر آغا ملک کے نامور ادیب، دانشور، شاعر، انشائیہ نگار، نقاد اور عہد ساز رسالہ ''اوراق'' کے مدیر تھے۔ ہر چند ان کا پیشہ کاشتکاری ہے، لیکن ادب ان کا عشق تھا اور وہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ اپنی ذاتی زندگی خلوت میں گزارنے کے عادی تھے۔ ان کا گاؤں وزیر کوٹ شہر سے کٹا ہوا ہے۔ سرگودھا میں ان کی رہائش گاہ شہر کے ایک ویران گوشے میں تھی۔ یہ گوشہ جب شہری آلائشوں سے بھر گیا اور ان کے گھر کے سامنے ایک سینما تعمیر ہو گیا تو وہ وزیر کوٹ واپس چلے گئے اور پھر اپنے بیٹے سلیم آغا قزلباش کی تعلیم کی تکمیل کے لیے لاہور آئے تو لاہور چھاؤنی میں سرور روڈ کے ایک خاموش گوشے میں اپنا وزیر کوٹ آباد کر لیا لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ان کی پہلی محبت ''صفیہ'' تھی اور وہی ان کی ادبی زندگی کی روح رواں تھیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' انہیں کے نام معنون ہے۔ وزیر آغا نے ان کا ذکر اپنی خودنوشت سوانح عمری ''شام کی منڈیر سے'' میں کیا تو لکھا:

> ''جن دنوں میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا تو میرے والد نے ہوسٹل کا خرچ بچانے کے لیے مجھے اپنے ایک عزیز کے ہاں بھجوا دیا جو ان دنوں موچی دروازے میں رہتے تھے، مرزا انور علی ان کا نام تھا۔ انتہائی شریف

اور مرنجاں مرنج انسان تھے اور بے حد غریب بھی..... چار برس کے بعد جب
میں نے لاہور چھوڑا تو اپنے اس عزیز کے ہاں جانے کا بہت کم وقت مل سکا،
لیکن ایک طویل بحرانی دور سے باہر آیا تو میں انہیں بطور خاص ملنے لاہور گیا.....
ان کا لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا اور بڑی بیٹی نے میٹرک میں قدم رکھا تھا۔ صفیہ
اس کا نام تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دنگ رہ گیا، بس اسی لمحے میں نے اپنی
زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرلیا۔"

اپنے خاندان کا واحد ایم اے پاس ہونے کے باعث وزیر آغا کی قدر و قیمت بہت زیادہ تھی، لیکن انہوں نے دولت کو پرکاہ کی حیثیت نہ دی اور 18 اپریل 1949ء کو بڑی سادگی سے اپنی زندگی کے پہلے اور آخری فیصلے پر عمل کیا۔ ان کے نزدیک سسرال والوں کی غربت کوئی ایسا گناہ نہیں تھا جسے ہدفِ طنز بنایا جاتا۔ پہلی ملاقات میں انہوں نے اپنی بیوی کو ایک خوبصورت بیاض بطور اولیں تحفہ دی، وزیر آغا اس سے بہتر تحفہ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "بعد کی زندگی میں مجھے کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، یہ بیاض دکھائی دیتی رہی اور پھر گم ہو گئی ہے۔"

صفیہ آغا سے شادی پر وزیر آغا کا تاثر یہ تھا جیسے وہ ایک طویل بن باس کے بعد "جنتِ گمشدہ" میں واپس آئے ہیں اور پہلی بار مسرّت، ایک تند و تیز موج کی طرح ان سے آ ٹکرائی اور وہ اس موج میں پوری طرح شرابور ہو گئے اور پھر ان کی زندگی کے سارے رویے صفیہ آغا نے تبدیل کر دیے، یعنی پہلے وہ مسرّت کے حصول کے لیے کوشاں تھے مگر اب مسرّت کی ماہیت دریافت کرنے کے درپے ہو گئے۔ اس کا نتیجہ ان کی اولین فلسفیانہ کتاب "مسرت کی تلاش" ہے۔ جس کی اشاعت کے ساتھ ہی ان کی بیٹی مینا کا پہلا نقرئی قہقہہ بیدار ہوا۔

سردیوں کے دن تھے، وزیر آغا اپنے بستر میں جاگ رہے تھے۔ چاروں طرف مکمل سکوت تھا اور پھر جیسے ایک گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا "یہ کون ہنسا؟" صفیہ ہنسی اور جواب دیا "یہ مینا تھی" آغا صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کی کتاب "مسرّت کی تلاش" پر اصل دیباچہ تو مینا نے لکھا ہے جو اس وقت سوا سال کی تھی۔ اس مسرّت خیز واقعے نے وزیر آغا کو نظم "حیاتِ نو" دی جس کا آخری بند حسبِ ذیل ہے:

آج میں ایک نئی چہکار سے جاگ اُٹھا ہوں
قہقہہ...... ننھی سی گڑیا کا در آیا چپ چاپ
اور میں خواب گراں بار سے جاگ اُٹھا ہوں

''مسرت کی تلاش'' کے بعد وزیر آغا نے ''نظم جدید کی کروٹیں'' ''اُردو شاعری کا مزاج'' ''شام کے سائے'' دن کا زرد پہاڑ، تخلیقی عمل ''تصورات عشق وخرد، اقبال کی نظر میں'' اور کم وبیش پچاس تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور انشائیہ کی کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں لکھنے کے لیے انہیں جس قسم کی طمانیت، یکسوئی اور ذہنی ارتکاز کی ضرورت تھی، وہ سب انہیں صفیہ آغا نے فراہم کیا۔

وزیر آغا سے میرا قریبی تعلق 1964ء میں ہوا جب میں بیدیاں (لاہور) جیسے دور افتادہ گاؤں سے تبدیل ہو کر سرگودھا میں ملازمت پر فائز ہوا تھا۔ پھر ہر شام وزیر آغا کے ہاں گزرنے لگی۔ ان کے مکان کی بالائی منزل ''زنان خانہ'' اور زیریں منزل ''مہمان خانہ'' تھا۔ ڈاکٹر صاحب صبح سویرے گوتم بدھ کی طرح بالائی منزل پر ایک نظر ڈال کر اپنے کتب خانے میں آجاتے لیکن وہ گوتم بدھ سے اس لحاظ سے مختلف تھے کہ بیگم وزیر آغا نہ صرف ان کی پوری نگہداشت کرتیں، بلکہ مہمانوں کے لیے وقفوں وقفوں سے چائے بھی بھجواتی رہتیں۔ وہ خانہ دار اور پردہ دار خاتون تھیں لیکن وزیر آغا کے ہر دوست کو اپنے گھر کا فرد سمجھتیں اور ان کے ساتھ بڑی محبت اور التفات کا سلوک کرتیں۔ سجاد نقوی اور اس ناچیز (انور سدید) کو تو وہ اپنا بھائی شمار کرتیں اور ہماری بیگمات سے مل کر ہمیشہ بے پایاں خوشی کا اظہار کرتیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وزیر آغا کا ذاتی کنبہ بڑا نہیں تھا۔ ایک بیٹا سلیم آغا جو افسانہ نگار اور انشائیہ نگار ہے اور بیٹی مینا جو شادی کے بعد علی پور (مظفر گڑھ) چلی گئیں۔

مینا کی رخصتی کے ساتھ ہی وزیر آغا اور صفیہ کی زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا۔ آغا صاحب نے اس واقعے کا ذکر اپنی سوانح عمری میں کیا تو لکھا:

> ''یکا یک ہم دونوں کو یوں لگا جیسے ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مینا کی رسمِ نکاح سے چند روز پہلے میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ ''اب ہمیں ان تمام خطوط کو تلف کر دینا چاہیے، جو ہم نے ایک دوسرے کو شادی کے پہلے دس سالوں میں لکھے تھے۔'' یہ وہ زمانہ تھا جب میری بیوی اکثر

اپنے والدین سے ملنے لاہور چلی جاتی تھی اور پھر کافی عرصہ وہیں رہتی تھی۔ لہٰذا ہمارا رابطہ خط و کتابت سے ہی قائم رہتا تھا۔ میری بیوی نے ان سب خطوط کو محفوظ رکھا ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس نے شادی کا سرخ جوڑا سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا، مگر اب بیٹی کی شادی تھی تو اس نے سرخ جوڑا تو بیٹی کو تحفتاً دے دیا اور خطوط کے بارے میں تجویز پیش کی کہ انہیں نذرِ آتش کر دیا جائے۔ سردیوں کے دن تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم دونوں نے پوری رات جاگ کر کاٹی۔ کوئلوں کی انگیٹھی سامنے پڑی تھی۔ وہ بآوازِ بلند اپنا لکھا ہوا خط پڑھتی اور میں اپنا...... یہ خط پڑھنے کے بعد اسے انگیٹھی میں ڈال دیا جاتا اور پھر وہ بھڑک اٹھتا...... رات بھر یہ کھیل ہوتا رہا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو ہماری زندگی کے پورے عہد پر رات کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔''

میں یہ واقعہ اقتباس کر رہا ہوں تو میری آنکھیں نم ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی پشت پر گزشتہ 55 برس تک صفیہ آغا کا ہاتھ رہا اور انہوں نے ادبی مخالفتوں، رنجشوں اور دشمنوں کو پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہ دی اور اپنا تخلیقی اور تنقیدی کام جاری رکھا تو انہیں صفیہ آغا کا تعاون ہمہ وقت حاصل رہا۔ انہوں نے وزیر آغا کی خانگی زندگی کو ہمیشہ خوشگوار بنائے رکھا اور انہیں تصنیف و تالیف سے مسرت کشید کرنے کی فرصت اور فراغت دی، لیکن اب وہ وزیر آغا کو تنہا چھوڑ کر خود زیرِ لحد چلی گئی تھیں تو میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ وزیر آغا کی آئندہ زندگی کس حال میں بسر ہوگی؟

صفیہ آغا کی وفات نے انہیں ایک گہرے دکھ سے دوچار کر دیا تھا، لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ دکھ کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ جانتے تھے اور صفیہ آغا کی وفات کے ساتھ ہی ان کی ''مسرت کی تلاش'' کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا تھا، جو دکھ کا دوسرا رُخ ہے سلیم آغا اور مینا ان کے سامنے تھے، وہ دونوں اور ان کے بچے صفیہ آغا کی ''کلوننگ کاپی'' ہیں، صفیہ آغا انہیں ہمیشہ اور ہر جگہ ان بچوں کی صورت میں نظر آتیں اور ان کو فکری اور تخلیقی طور پر تر و تازہ رکھتیں، لیکن 19 اگست 2010ء کو ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے یوں لگا کہ ان کا ذہن تر و تازہ ہے لیکن جسم ساتھ نہیں دے رہا۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور نظر آرہے تھے اور پھر ستمبر 2010ء کی نصف شب فرشتۂ اجل آیا تو انہیں صفیہ آغا کے پاس عقبیٰ میں لے گیا۔

و، ع، خ

بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ حصولِ رزق کے سلسلے میں مجھے ایک گاؤں بیدیاں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ بیدیاں نواح لاہور میں واقع ہے اور اس سے ملحق ہونے کے باوجود اس سے یکسر کٹا ہوا تھا۔ میں صبح اُٹھتا تو دن بھر کی مشقت کے لیے لاہور کے ہنگاموں میں کھو جاتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو گاؤں کی پرکیف فضا سارے دن کا گرد و غبار دھونے سے قاصر رہتی۔ لاہور اور بیدیاں میں کچھ عجیب سا تضاد تھا۔ ایک طرف شور وشر، ہنگامہ خیزی، تماشا آرائی، حلقہ بندی، سیاست آرائی اور رزق کے حصول کے لئے تگ و دو کا ایک سلسلہ تھا جس کی ڈور پھیلتی ہی جاتی تھی اور جس کا سرا ہاتھ میں آکر بھی گرفت میں نہ آتا تھا۔ لمبی چمنیوں سے اُٹھتا ہوا کثیف اور غلیظ دُھواں سورج کے منور چہرے پر اُداسی ڈال دیتا تھا دوسری طرف فطرت نے اپنے بوقلموں خزینوں کا منہ کھول رکھا تھا۔ رات پھیلتی تو ستاروں کے کارواں باتیں کرنے لگتے۔ صبح ہوتی تو پرندوں کی چہچہاہٹ استقبال کرتی۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے کھیت سکوتِ سخن ہو کا منظر پیش کرتے۔ کسان کا ہل زمین کا سینہ چیرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے دھرتی کا باسی اپنی تقدیر خود تحریر کر رہا ہے، لیکن شہر کا شور و شغب میرے ذہن پر اس طرح حاوی تھا کہ ہستی اور نیستی کا بارِ گراں کبھی کم نہ ہوتا۔ پھر اسی لمحے گیراج سے بھاری بھرکم جیپ ایک کلبلاہٹ کے ساتھ میرے گھر کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی تو مجھے روزمرہ کا کام یاد آ جاتا۔ لاہور پیر تسمہ پا کی طرح میری گردن پر سوار ہو جاتا اور بے قرار روح کثافتوں کے انبار تلے دب جاتی۔

میں دو نہایتوں کے درمیان لٹکا ہوا ایک ایسا انسان تھا جس کا باطن دیمک چاٹ رہی تھی۔ جس کی کوئی منزل نہیں تھی اور جو خارج کی اجتماعی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے سماجی مشین کا پرزہ بنا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے جب رزق کی تلاش میں گھر سے باہر جاتا تو میں اپنے اندر کے انسان سے دریافت کرتا۔

''بتا تو کون ہے؟ اور تیرے اس عمل کا منتہا کیا ہے؟
میری زندگی میں شاید وہ لمحہ جنم لے رہا تھا جب مشین کا پرزہ مشین کے احکام کی تعمیل سے انکار کر دیتا ہے۔

انہیں دنوں میری توجہ ایک جٹادھاری فقیر نے کھینچی جو ریگل چوک کے ایک پرشور کونے میں صبح سے شام تک انگشت شہادت بلند کیے کھڑا رہتا اور تھوڑے تھوڑے وقفوں سے ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتا۔

''اپنے آپ کو پہچانو۔''

زندگی کی مشین سے چمٹے ہوئے ہزاروں انسانوں کا انبوہ یہ صدا سنتا ہوا گزر جاتا، لیکن کوئی ایک بھی تو نہیں تھا جو اس جٹادھاری فقیر کی طرف توجہ دیتا اور اس سے ''اپنے آپ کو پہچانو'' کا مطلب پوچھتا۔ میرا ذہن اَن گنت بے سروپا معموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جٹادھاری فقیر کا نعرہ بھی تمام تر چیستان تھا۔ ایک دن میں نے سارا تشکک اس کے آگے اگل دیا اور سکون کا جویا ہوا۔ فقیر میری باتیں بڑے شانت سبھاؤ سے سنتا رہا۔ مسکراتا رہا اور آخر میں کھلکھلا کر ہنس پڑا، کہنے لگا:

''منش، جس برہما کو تو ڈھونڈتا ہے، وہ تیرا اپنا آتم دیو ہے۔ تیرے اندر بستا ہے اور تیرا اپنا آپ ہے۔ بس اپنے آپ کو پہچان۔ نش کام کرم کر، بدھی سے اُونچا اُٹھ۔ یہی نروان کی راہ ہے۔''

فقیر کے بعض الفاظ میرے لیے اجنبی تھے، لیکن مفہوم نامانوس نہیں تھا۔ اس کے جملے انسانوں کے اس جنگل میں انوکھے محسوس ہوئے اور روح پر جیسے امرت کی بوندیاں گرنے لگیں، پھر میں اس فقیر کی خدمت میں ہر روز حاضر ہونے لگا۔ دو چار لفظوں کا ''اپدیش'' لیتا اور اس کا مفہوم تلاش کرنے کے لیے اپنے من کی دنیا میں ڈوب جاتا۔ فقیر ایک دن پوچھنے لگا تمہیں مہاوا کیہ بتاؤں؟ تمہارا جیون سپھل ہو جائے!

میں نے عرض کیا ''مہا کیہ جان کر کیا کروں گا۔ مجھے اس جیون کا نہیں، اگلے جیون کا خیال ہے۔'' فقیر نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ شاید میری طلب کی صداقت کر پرکھ رہا تھا۔ شاید اسے میری دنیاداری کا امتحان مقصود تھا۔ پھر بولا:

''سچے آنند کی تلاش ہے تو تمہیں شمال مغرب کی جانب سفر کرنا ہوگا۔ جہاں پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا اور جہاں ندیاں درختوں کی چپ گپھا میں بہتی ہیں، وہاں خاموشی کا راج ہے۔ وہیں رشیوں کی شاو گوانوالے کے کہانی، دوع، خ اپنی سبھا جمائے بیٹھے ہیں۔ جو کچھ میرے پاس تھا، کہہ چکا۔ اب

اے منش! اس سے آگے ان کے سامنے دامن پسار!''

اگلے روز میں نے اپنے کام کاج سمیٹے، دفتر سے چھٹی لی، اپنا رخت سفر باندھا اور شمال مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ریل میں سفر کیا، پھر ریل نے مجھے کھٹارا بس کے حوالے کر دیا۔ پھر ایک مقام ایسا آیا جہاں پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا اور دھرتی کے میالے سینے کے عین وسط سے ایک شفاف ندی پھوٹ رہی تھیں آگے بس کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں یکے پر سوار ہو گیا۔ کچھ دور تک یکہ چلا اور جب کچی سڑک کے نقوش بھی مٹ گئے تو یکے نے ایک بے سمت خطہ زمین پر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ تب میں خود زمین پر اتر آیا اور پیدل ہی رشی کے دیش کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ تہذیبی شہروں اور ہنگاموں سے پر بازاروں سے دور، خرافات اور مکروہات سے ناآشنا گھنے درختوں میں گھرا ہوا یہ ایک ایسا خطہ تھا جہاں سکون تھا، امن تھا، شانتی تھی۔ برگد اور پیپل کے صدیوں پرانے درختوں کے نیچے ایک گمبھیر چپ کا راج تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میری رفتار ٹرین، بس اور یکے کے ساتھ بتدریج مدھم ہوتی چلی گئی ہے اور جب میں اپنے پیروں پر چلنے لگا تو میں فطرت کی رفتار سے کلیتاً ہم آہنگ ہو گیا تھا..... جسم کی رفتار کے اس طور کم ہونے سے رُوح کی رفتار بھی کچھ کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی شاید اس فضا میں یہ گیان کی پہلی منزل تھی۔ چپ کے اس سمندر میں مجھے ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جس کا درشن تمام دکھوں کا مداوا تھا اور جس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ روشنیوں کی جوالا بکھیر سکتا تھا۔

میں و، ع، خ سے مل کر سناٹے میں آ گیا۔ 88 برس کے ایک معمر بزرگ جنہوں نے زندگی کے ہزاروں جوار بھاٹے سر کئے تھے اور جن کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی، ایک بوڑھے جہاں دیدہ برگد کے نیچے کھاٹ پر براجمان تھے۔ میں حیران تھا کہ ان کی وضع قطع میں روایتی جوگیوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ گیروے کپڑے، نہ لمبی لمبی خاک آلود جٹائیں، نہ راکھ کی دھونی، لیکن ان کے چہرے پر بے پایاں طمانیت اور بے ریغ شانتی تھی۔ ایک سکون تھا جس کا کوئی انت نہیں تھا میرا دل ایک لمحے کے لیے اپنی دھڑکن بھول گیا۔ تب میں نے ان کے جمال کا سحر اپنی رگ و پے میں اترتے ہوئے محسوس کیا۔ جب عرض مطلب کے لیے لب کھولے تو انہوں نے ہاتھ کے ایک بامعنی اشارے سے مجھے روک دیا اور پھر میرے سامنے میرے داخلی دکھ کے سارے تارو پور بکھیر دیئے۔ میرے دل کو جیسے توانائی ملنا شروع ہو گئی اور اس کی دھڑکن مجھے محسوس ہونے لگی، لیکن اب اس دھڑکن کا سارا نظام و، ع، خ کی گرفت میں تھا

اور وہ روح کی اتھاہ گہرائیوں سے کلام کر رہے تھے اور اُن کہی سنا رہے تھے۔ ان دیکھی دکھا رہے تھے۔ دل پر گرے ہوئے پردوں کو ہٹا رہے تھے۔

آج کئی برسوں (شاید نصف صدی سے بھی زیادہ) کے بعد جب میں اس لمحے کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہوں تو میرے لیے یہ بالکل ممکن نہیں کہ و، ع، خ کے ملفوظات کے ہزارویں حصے کو بھی بیان کر سکوں اور بالفرض مجھے یہ سکت مل بھی جائے تو میں نہیں جانتا کہ اس خوشبو کو کس زبان میں منتقل کروں۔ طمانیت قلب کی تو کوئی زبان نہیں ہوتی، اسے تو صرف روح کی سطح پر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس گاؤں کے ایک عمر رسیدہ بزرگ نے مجھے بتایا کہ و، ع، خ کی زندگی کا پہلا دور آوارہ خرامی میں بسر ہوا۔ انہوں نے نہ صرف بیسویں صدی کے جملہ فکری، سیاسی اور تہذیبی نشیب و فراز دیکھے تھے، بلکہ وہ برصغیر ہند کے تمام دشوار گزار مقامات پر برسوں گھومتے بھی رہے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب وہ لاہور میں اقامت پذیر تھے تو وہ سوامی رام تیرتھ کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ علامہ اقبال سے مراسلت کے آثار بھی ملتے ہیں، لیکن پھر انہوں نے لاہور چھوڑ دیا اور دوبارہ کبھی اس شہر میں اقامت پذیر نہیں ہوئے۔ وہ طمانیت قلب کے متلاشی تھے اور ان کا بڑا مقصد عرفان حیات حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ بڑے بڑے صحافیوں، اولیاؤں، ویدانیوں اور یوگیوں کی تلاش میں انہوں نے سینکڑوں میل پیدل سفر کیا۔ دکن کے پہاڑوں، ایلورا اور اجنتا کے علاوہ وہ ہمالیہ کے دامن میں بکھرے ہوئے ان گنت مقدس مقامات گپھاؤں اور یوگیوں کے استھانوں پر جاتے رہے۔ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء اور حضرت مجدد الف ثانی کے مزاروں پر مہینوں قیام کیا اور اس عرصے میں اس زمانے کے تقریباً ہر صوفی اور ویدانتی سے تبادلہ خیالات کیا۔ پچاس برس کی عمر تک انہوں نے تصوف اور ویدانت کی تمام اہم کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ فرمایا کہ

''میں مختلف علمی مراکز سے کتابیں بوریوں میں بھر کر لایا کرتا تھا اور رات رات بھر ان کا مطالعہ کرتا رہتا۔ میرا طریق یہ تھا کہ درمیان سے کتاب کے دھاگے کو توڑ دیتا۔ کتاب کے اوراق الگ الگ کر دیتا اور پھر مٹی کے تیل کے دیئے کی روشنی میں ایک ایک ورق پڑھتا اور اسے دوسری طرف پھینکتا جاتا۔ اچانک موذن کی اذان سے مجھے احساس ہوتا کہ صبح ہو گئی ہے۔''

اس انہماک اور لگن سے شاید ہی کسی نے کسی موضوع کا مطالعہ کیا ہو۔

پچاس برس کی عمر میں و، ع، خ نے مطالعہ ترک کر دیا اور اپنی ساری شکتی روشنی کے حصول میں

صرف کر دی، اب گہری ریاضت کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب وہ لفظوں کے ''اندر جال'' سے رہائی حاصل کر کے روشنی کی زبان کو اختیار کر رہے تھے کہ عرفانِ ذات کے لیے روشنی کی زبان کے علاوہ اور کوئی وسیلہ نہیں۔ فرمایا کہ ''ریاضت اور مراقبے کی اِنہی کٹھن راہوں میں انہیں ''انجو'' ہوا۔ عرفانِ ذات اور عرفان کائنات حاصل ہوا اور خاک و افلاک کے جملہ راز ہائے سربستہ ایک نہایت سادہ صورت میں ان کے سامنے آ گئے اور پھر ایک گہری طمانیت اور بے پناہ سکون کسی خوشبو کی طرح ان کے ہر موئے بدن میں سرایت کرتا چلا گیا۔ یکا یک آغاز و انجام، خیر و شر، روشنی اور تاریکی کی ساری دوئی مٹ گئی اور ایک بے پایاں روح کل کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ و، ع، خ کا ارشاد ہے کہ اس روشنی کو بیان نہیں کیا جا سکتا اور اس شانتی کی توضیح نہیں ہو سکتی۔ ہاں روشنی دکھائی جا سکتی ہے اور شانتی کا احساس کرایا جا سکتا ہے اور وہ بھی اُنگلی پکڑ کر......اور پھر وہ یکا یک چپ ہو گئے اور ایک ایسی لطیف کیفیت میں تحلیل ہو گئے جس کا کوئی کام نام نہیں۔

ڈاکٹر زیر آغا کی پہلی ملاقات اپنے والدِ محترم و، ع، خ (آغا وسعت علی خان) سے اس وقت ہوئی جب وہ ایم اے کے طالب علم تھے۔ وزیر آغا نے محسوس کیا کہ ان کی ساری شخصیت ان کی آنکھوں میں سمٹی ہوئی تھی اور کوئی ان سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہپناٹزم کے بھی ماہر تھے اور کئی بار اس کا مظاہرہ بھی کر چکے تھے، لیکن ان کی شخصیت کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ وہ تصوف اور ویدانت کے اسکالر تھے اور سلوک کی اتنی منازل طے کر چکے تھے کہ اب وہ ایک Charismatic Personality کے مالک بھی بن چکے تھے۔ آغا صاحب کو ان کی ''سنگت'' میں بیٹھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح ''شام کی منڈیر سے'' میں لکھا ہے:

> ''سنگت کی صورت یہ تھی کہ وہ ہر روز دو تین گھنٹوں کے لیے بڑ کے درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر نیم دراز ہو جاتے اور ان کے سامنے گاؤں کے چند عمر رسیدہ لوگوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی آ بیٹھتے۔ وہ سب ہمہ تن گوش ہوتے، جبکہ و، ع، خ ایک تار باتیں کرتے چلے جاتے۔ میں از راہ تجسس ایک روز چپکے سے اس سنگت میں شامل ہوا اور ہر چند کہ ان کی باتوں کی ساری تہیں تو مجھ پر منکشف نہ ہوئیں تاہم مجھے محسوس ہوا کہ ان کے سراپا سے روشنی کی ایک شعاع سی برآمد ہو کر مجھ میں سما گئی ہے۔''

وزیر آغا نے و، ع، خ سے فیوض حاصل کرنے کی کچھ تفصیل اپنی سوانح عمری میں لکھی ہے اور ان کی تعلیمات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مثلاً جز اور کل کے فرق کو بیان کرتے ہوئے کہتے:

''جز کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کل میں جذب ہونے کی کوشش کرے۔ قطرے کو کیا پڑی ہے کہ وہ سمندر کی تلاش کرے۔ قطرے کو تو خود یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ خود سمندر ہے۔ قطرہ اور سمندر دونوں پانی ہیں، مقدار اور حجم کا فرق بے معنی ہے۔ فرق جوہر کا ہوتا ہے اور جوہر کے اعتبار سے قطرے اور سمندر میں کوئی فرق نہیں۔''

''صوفی'' کا کام فقط یہ ہے کہ وہ تمہاری آنکھوں کا رُخ تبدیل کر دے۔ ایسا کرنے کے لیے آنکھوں کے سامنے آئینہ لانے کی ضرورت ہے۔ تب آنکھیں خود کو دیکھنے لگیں گی، روحانی اعتبار ہی سے نہیں، مادی اعتبار سے بھی۔ پوری زندگی بلکہ پورا موجود (Existence) ایک ہے۔ اس میں دوئی کا ہونا محض فریب نظر ہے۔''

وہ دنیا کو ترک کرنے یا سنیاسی اختیار کرنے کے روایتی تصور کو نہیں مانتے تھے، کہتے:

''ترک کیسے کرو گے؟ جہاں جاؤ گے نئے رشتے وجود میں آ جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ رشتوں میں تبدیلی آئے گی...... سو ترک کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کلبلاتی ہوئی نام روپ کی حامل کائنات میں رہتے ہوئے تم نام روپ سے اُوپر اٹھ جاؤ اور لحظ بھر کے لیے خود کو اتنا پھیلاؤ کہ ہر شے تمہارے وجود کا حصہ بن جائے۔ بس یہی اصل معرفت ہے۔'' (''شام کی منڈیر سے'' ص 56)

و، ع، خ کتابوں سے متنفر ہو گئے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کتابوں میں الفاظ کا ضیاع بہت زیادہ تھا۔ کہتے کہ لفظ تو جن کی طرح ہے۔ اس پر قابو رہے تو تابع رہتا ہے۔ بے قابو ہو جائے تو اس سے جان کا خطرہ ہے۔'' ان سے ملنے والے ان کی سادہ زبان اور تمثیلی اسلوب سے بہت متاثر ہوتے اور محسوس کرتے کہ ان کا علم کتابی نہیں بلکہ روحانی تجربے سے پھوٹا تھا۔ ترک دنیا کی وضاحت کے لیے انہوں نے ایک راجہ کا قصہ سنایا'' جو معرفت کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز تھا۔ ایک شخص کو یہ بات غلط نظر

آئی۔ اس نے سوچا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی دنیادار راجہ اس مقام سے بھی آشنا ہو۔ سو راجہ کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی اُلجھن بیان کی۔"

''راجہ نے دربان سے کہا کہ پانی سے لبالب بھرا ہوا ایک پیالہ اس شخص کی ہتھیلی پر رکھ دیا جائے۔ پھر راجہ نے کہ اس شخص کو بازار سے گزارا جائے، اگر پیالے میں سے ایک قطرہ بھی چھلکے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ سو یہ شخص روانہ ہوا اور گھنٹہ بھر کے بعد دربار میں واپس آیا تو راجہ نے اس سے پوچھا کہ اس نے بازار میں کیا کچھ دیکھا۔ اس شخص نے کہا۔'' راجہ میں تو اس پیالے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے تو بازار نظر ہی نہیں آیا۔ اس پر راجہ بولا اے شخص! تو صرف چند لمحوں کے لیے پیالے میں غرق ہوا۔ میں تو سدا اس میں ڈوبا ہوا ہوں۔''

(حوالہ ایضاً ص 57)

مجھے یاد ہے کہ میں نے ان سے سنی ہوئی ایک تمثیل ''اردو زبان'' سرگودھا کے سال نامہ 1968ء میں ایک مضمون کے نیچے بچی ہوئی جگہ پُر کرنے کے لیے درج کی تھی جسے ایک مشہور ترقی پسند ادیب کھینچ کر اپنی طرف لے گئے اور نہ صرف ناراض ہو گئے بلکہ دشنام طرازی پر بھی اُتر آئے۔ تمثیل یہ تھی:

''پیارے! ایک کہانی سن! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دریا چڑھاؤ پر تھا، تیز ہوا چل رہی تھی، موجوں نے کہرام مچایا ہوا تھا۔ دریا کا سر پر خواہشات کی آماجگاہ تھا۔ وہ بے قرار تھا۔ اس کے ہر دے کا طوفان جوالا مکھی کی طرح پھٹ کر باہر آ گیا تھا۔ اس دریا کے کنارے ایک ویدانتی اور ایک یوگی اکٹھے ہوئے۔ دونوں کو دریا پار کرنا تھا۔ اتفاق سے وہاں ایک کشتی آ گئی۔ ویدانتی نے کشتی والے کی ہتھیلی پر دو پیسے رکھ دیئے اور کہا مجھے دریا کے پار اُتار دے، مگر یوگی نے ویدانتی کی اس حرکت کو طنزیہ تبسم کا ہدف بنا اور ویدانتی کو بھی حقارت سے دیکھا...... ویدانتی کشتی میں بیٹھ کر دریا کے پار اتر گیا، مگر یوگی نے ساری عمر ریاضت کی تھی۔ وہ پانی پر چلنے لگا اور دریا کو پار کر گا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ایک بار پھر ویدانتی اور یوگی ایک دوسرے کے روبرو کھڑے تھے، مگر اب

ویدانتی کے ہونٹ تبسم میں بھیگے ہوئے تھے۔

اس نے یوگی سے برملا کہا "پیارے تو نے اپنا سارا جیون ضائع کر کے صرف دو پیسے کا کام سیکھا ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا نے رسالہ 'اوراق' میں ان کے چند خطوط جو انہوں نے ہندوستان کے ایک ویدانتی رادھے شیام کے نام لکھے تھے، شائع کیے تو ان کے تعارف میں یہ بھی لکھا:

"جناب و، ع، خ پاکستان اور بھارت کے عارفوں اور ویدانتیوں میں ایک مقام امتیاز کے مالک ہیں...... تقسیم ملک کے بعد مولانا صلاح الدین احمد، پروفسر حمید احمد خان، ابوالاثر حفیظ جالندھری، عارف عبدالمتین، آغا محمد باقر، بشیر 'آزاد، شیخ عبدالشکور، قیوم نظر، وجیہہ الدین احمد، جعفر طاہر، کمار پاشی، صلاح الدین ندیم اور بہت سے دوسرے ادبا شعرا تصوف کے لطیف نکات کی تفہیم اور توضیح کے سلسلے میں ان کی طرف رجوع کرتے رہے۔" (اوراق، شمارہ3-1966ء، ص230)

ان کی بیاض سے چند نکات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

"جسم کی حقیقت روح ہے اور روح کی حقیقت خدا۔ وہ روح کا جوہر ہے...... ذاتِ پاک! جاننے والے کو بھلا کیسے جانا جا سکتا ہے۔ خدا نہ جاننے کے قابل ہے اور نا قابل۔ وہ ان دونوں باتوں سے ماورا ہے۔"

....

"میں ایک درویش ہوں۔ کسی ناجائز دباؤ یا بات کو ماننے کے لیے میں ہرگز تیار نہیں۔ اس کے لیے چاہے مجھے جس قدر دُکھ اُٹھانے پڑیں...... بحیثیت درویش میرا یہ فرض ہے کہ لوگوں کے دُکھ دور کروں۔ اگر آج میں کسی انسانی قوت کے دباؤ سے ڈر گیا تو کل خدا کے سامنے کیا جواب دوں گا؟

....

"اگر منش اپنے ملک اور مذہب کے لیے میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے جان دے تو وہی درجہ پاتا ہے جو یوگی دھیان میں کھو کر!"

....

"جو شے جدا کرتی ہے بری ہے...... جو شے ملاتی ہے اچھی ہے۔"

....

''پیارے! ڈر تیرے اندر ہے، باہر نہیں۔''

....

''بادل سورج کو نہیں ڈھکتا بلکہ دیکھنے والے کی آنکھ کو ڈھکتا ہے۔''

....

''برائیاں اگر لوہے کی بیڑیاں ہیں..... تو نیکیاں سونے کی بیڑیاں۔''

....

''خدا کو وہی مان سکتا ہے جو ہر شے کو ماننے سے انکار کر دے۔''

....

و، ع، رخ وعظ و نصیحت کی محفل سے رات گئے فارغ ہوتے تو اپنے خلوت کدے کی تنہائی میں گم ہو جاتے اور پھر اگلی صبح گل نو دمیدہ کی طرح برآمد ہوتے۔ 7 جنوری 1970ء کی رات کو بھی وہ اپنی روح کو جسم کے زنداں میں سمیٹ کر خلوت کدے میں یادالٰہی میں مصروف ہو گئے تھے۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ و، ع، رخ کے چہرے پر ایک جاودانی مسکراہٹ طاری تھی کمرہ خوشبو سے معطر تھا، لیکن روح عالم بالا کو سدھار گئی تھی..... ملک کے ممتاز افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو بقول ان کے..... ''فوراً ذہن قرآن پاک کی سورۂ الفجر کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی!''

نقوی صاحب نے لکھا ہے:

''تصوف ان کے نزدیک زندگی کی ارفع اقدار کو عمل میں لانے کا نام تھا۔ مجھے ان سے دو بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ دونوں مرتبہ جب ان کے پاس سے اُٹھا تھا تو میں نے اپنی روح کی گہرائیوں میں ایک سرمدی کیف محسوس کیا تھا، جیسے اطمینان کے چند چھینٹے پڑے ہوں۔'' (اوراق جون 1970ء ص 7)

8 جنوری 1970ء کی صبح کو و، ع، رغ اپنے گاؤں میں دفن ہوئے۔ ان کی قبر پر ہر وقت فاتحہ خوانی ہوتی ہے، لیکن نہ میلہ لگتا ہے نہ عرس منایا جاتا ہے۔ وہ رسوم و قیود سے بے نیاز تھے۔

اختتامیہ

سرگودھا کی سرزمین میں تین خوبیاں ہیں، یہ مردم شناس ہے، وقت شناس ہے اور ادب شناس بھی، لیکن ادبی حوالے سے اس کی زرخیزی مستند بھی ہے اور مانی ہوئی بھی۔ اس علاقے نے بہت نام ورلوگ پیدا کیے ہیں، جنھوں نے ادبی دنیا میں نہ صرف نام کمایا، بل کہ کام کے حوالے سے بھی اپنی انفرادیت، اہمیت اور افادیت کو ایک زمانے پر ثابت کر دکھایا اور تاریخ ادبیات میں یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ اُردو شاعری کا تذکرہ ہو یا پھر اُردو تنقید کا، افسانے کا ذکر آئے یا پھر انشائیہ نگاری کا، مضمون نویسی کی بات ہو یا پھر کہانی کی، سرگودھا کے ان سپوتوں کا نام لیے بغیر نہ بات بنتی ہے نہ ادب کے تذکرے مکمل ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان ثقہ نقادوں، ادیبوں اور شاعروں میں غلام جیلانی اصغر، اصغر سودائی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید کے نام نہایت معتبر نام ور اور محترم خیال کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے کام اور نام کی مناسبت سے ہر دو سطح پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں، اُردو تنقید میں تو ان کا کام اب نصابی سطح پر معروف ہے اور طالبان علم و ہنر اپنی آبیاری اور تشنگی کی خاطر، ان کے چشمہ ہائے علم وفن سے سیرابی حاصل کرتے رہتے ہیں، ڈاکٹر انور سدید نے بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں، وہ ایک زود نویس قلم کار کے طور پر بھی مشہور و معروف ہیں، لیکن زود نویسی بھی کسی کسی کو نصیب ہوئی ہے، یہ انعامِ خداوندی ہے، وہ اپنے خاص خاص بندوں کو اس ہنر سے نوازتا ہے اور یہ بات اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ ہمیں مختصر سی تحریر بھی لکھنی ہو، تو کئی کئی دن سوچتے گزر جاتے ہیں، پھر اگر طبع رواں ہوتی ہے، تو قلم اس کا ساتھ نہیں دے پاتا اور اگر قلم ساتھ چلنے کے لیے راضی ہوتا ہے، تو وقت اور ماحول اور فضا کی ناآسودگی آڑے آجاتی ہے۔ لکھنے والے کے لیے یہ تینوں باتیں بہت اہم اور اشد ضروری ہیں کہ اس

کی طبیعت بھی مائل ہو، قلم بھی اس کا ساتھ دے اور وقت بھی آسودہ خاطری کا ہو۔ بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ تینوں باتیں اکٹھی ہو کر کسی کسی کے نصیب میں آئیں ہے، پھر جس کے حصہ میں یہ نعمتیں آئیں، اسے بہ جا طور پر خوش نصیب کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید یقیناً ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، جنھیں وقت نے اپنی مہربانیوں سے نوازا اور انھیں موقع بھی دیا کہ وہ جس سہولت سے چاہیں، اپنے قلم اور فکر اور سوچ کو ضبطِ تحریر میں لاسکیں، ڈاکٹر صاحب نے اپنی ساری زندگی، وہ ملازمت کے دوران ہو یا ملازمت سے سبک دوشی کے بعد، ادب کی ترویج اور فروغ کے لیے دان کر رکھی ہے، ان کی علمی اور ادبی لحاظ سے کئی جہات ہیں، ان کی فکر یک رخی اور یک سطحی نہیں ہے، انھوں نے ادب کی سیرابی اور سیر یالی کے لیے ہمہ وقت کوشش جاری رکھی ہوئی ہے، چند برس قبل ان کی فنی زندگی کی ایک اور جہت ہمارے سامنے آئی اور وہ ہے شاعری کی جانب ان کا مائل ہونا، شاعری کا رنو جوانان ہے، ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ عمر کے بہت ہی سنجیدہ حصے میں ڈاکٹر صاحب نے اس کام کا آغاز کیا ہے، جس کی بنیاد صرف محبت کے والہانہ جذبے پر استوار ہوتی ہے اور یقیناً یہ جبلی اور بنیادی جذبہ ان کے اندر موجود تھا، لیکن اسے یا تو ڈاکٹر صاحب نے دبائے رکھا یا پھر اس جذبے کو خود نمائی کے لیے بہت تگ و تاز کرنی پڑی یا پھر بہت دنوں تک انتظار کی صعوبتیں اٹھانا پڑیں، بہ ہر حال دیر آید درست آید۔

کہتے ہیں تخلیق کار کے اندر بچہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے، لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ لکھنے والے کی عمر کے ساتھ ساتھ اکثر یہ بچہ بھی بڑا ہو جاتا ہے اور پھر وہ سارے کام بڑوں کی طرح کرنے لگتا ہے، یعنی جھوٹ، فریب، دغا، مکاری، ہوس کاری، محبت سے بیزاری اور پھر معاشرتی قدروں سے انکاری، لیکن انور سدید صاحب کے ہاں یہ بچہ ابھی تک بچہ ہی ہے بڑا نہیں ہوا اور یہ بات ان کی تحریروں سے بھی ثابت ہے، بچے کی سی حیرانی، بچے کا سا تجسس اور بچے کی سی جستجو اور تلاش ان کی تحریروں میں ایک ادھوری جھلک دکھاتی ہے اور ادھورا پن ہی دراصل تخلیق کار کو آگے بڑھنے پر اکساتا ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب اپنے تخلیقی سفر کو ابھی تک جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں اور ایک تسلسل کے ساتھ اور ایک ذمہ داری کے ساتھ یہ کام نبھانے میں کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید 4 دسمبر 1928ء کو (میانی) ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے، والدین نے ان کا نام محمد انور رکھا، جو بعد ازاں سکول کے رجسٹر اور میونسپل کمیٹی کے کھاتے میں بھی درج ہوا، لیکن آج ادبی

دنیا میں انھیں اس نام سے، سوائے چند لوگوں کے شاید کوئی نہیں جانتا، انھوں نے ایم اے اُردو بھی کیا، اس امتحان میں گولڈ میڈل بھی حاصل کیا اور پھر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی، لیکن روزی روٹی کے لیے انھیں انجینئرنگ کے شعبہ سے منسلک ہونا پڑا، یہ ایک خوب صورت تضاد ہے، جوان کی عملی زندگی کو مزید آسودہ حال بناتا چلا گیا۔ ان کی تحریروں میں جو ایک تمکنت، آسودہ خاطری، سلاست، فصاحت، بلاغت ہے، وہ شاید اسی تضاد کی وجہ سے ہے اور پھر ان کی زندگی کا پھیلاؤ ایک سے زیادہ سمتوں میں رہا، اس سفر کی رنگا رنگی سے بھی ڈاکٹر صاحب نے بہت کچھ کشید کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ''اُردو ادب کی تحریکیں'' کے عنوان سے مقالہ تحریر کر کے پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، یہ مقالہ بھی ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح نہایت اہم ہے، لیکن کسی وجہ سے جلد اشاعت پذیر نہ ہو سکا، پھر مشفق خواجہ کی وساطت سے یہ مقالہ انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوا، اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ کتاب نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر بہت مقبولیت حاصل کی اور نصاب میں بہ طور معاون کتاب کے شامل کر لی گئی، اس کتاب کا دیباچہ محترم جمیل الدین عالی نے تحریر فرمایا، اس کے علاوہ بھی ڈاکٹر صاحب کی اور بھی بہت سی نمایاں اور اہم کتب ہیں، جن میں 'پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اُردو میں انشائیہ، اُردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، غالب کا جہاں اور فکر و خیال، اقبال کے کلاسیکی نقوش، ذکر اس پری وش کا اور میر انیس کی اقلیم سخن زیادہ مشہور و معروف ہیں۔

محکمہ آبپاشی سے بہ طور ایگزیکٹو انجینئر سبک دوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے زیادہ خشوع و خضوع کے ساتھ اپنا علمی اور ادبی کام جاری رکھا، انھوں نے مجیب الرحمٰن شامی کے ادارے میں ''قومی ڈائجسٹ'' کے مدیر کے طور پر فرائض انجام دیے، پھر روزنامہ ''خبریں'' میں صحافتی دلچسپی کو فروغ دیا اور تین سال تک ضیا شاہد کے ساتھ کام کرتے رہے، پھر روزنامہ ''نوائے وقت'' میں بہ طور اداریہ نویس شرکت کر لی اور 2005ء تک ''نوائے وقت'' کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے رہے، ''نوائے وقت'' سے تو ان کا رابطہ آج بھی قائم ہے، لیکن یہاں ایک بات بہت ہی اہم ہے اور قارئین کی دلچسپی کے لیے عرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت کوئی 87 برس کے ہونے کو آئے ہیں، چشم بددور، یہ عمر عموماً آرام کرنے اور اپنے کام کو سمیٹنے کی ہوتی ہے یا پھر انسان اعصابی طور پر اتنا تھک جاتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کی جانب

خیال ذرا کم ہی آتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کو اس معاملے میں امتیاز حاصل ہے کہ آج بھی کسی نہ کسی اخبار میں یا پھر کسی نہ کسی ادبی رسالے میں ان کا تحریر کردہ مضمون دیکھنے کو مل جاتا ہے اور خوشی ہوتی ہے کہ وہ تخلیقی سطح پر نہ صرف رواں دواں ہیں، بل کہ عصری ادب سے بہ خوبی آگاہی رکھتے ہیں۔ ان کا شمار بہت ہی وسیع المطالعہ ادیبوں میں ہوتا ہے، پاکستان میں تخلیق پانے والا ادب، ہمسایہ ملک ہندوستان میں لکھا جانے والا ادب اور یورپی ادب پر بھی ان کی نگاہ ہے۔ وہ جہاں نام ور ادیبوں شاعروں کی تخلیقات سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں، وہاں نوجوان اور نوآموز لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں دوستوں کے حوالے سے ہمیشہ معیار اور مقدار کا خاص خیال رکھا ہے، بہت ہی کم دوست بنائے ہیں اور پھر ان کے ساتھ دوستی نبھانے میں لگ گئے ہیں۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے:

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ڈاکٹر انور سدید کے دوستوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام الثقلین نقوی، سجاد نقوی، فرخندہ لودھی اور صابر لودھی شامل ہیں اور باقی رہے نام اللہ کا۔

آج کل ان کی صحت، اگرچہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش نہیں ہے اور پھر وقت کا تقاضا بھی شاید یہی ہے، لیکن ان کی ادب سے غیر مشروط وابستگی کے سبب ہم دعا گو ہیں کہ اللہ انھیں عمرِ دراز سے نوازے۔ آمین

(ادارہ)

ڈاکٹر انور سدید اپنے کام اور نام کی مناسبت سے ہر دو سطح پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اُردو تنقید میں تو ان کا کام اب نصابی سطح پر معروف ہے اور طالبان علم و ہنر اپنی آبیاری اور تشنگی کی خاطر ان کے چشمہ ہائے علم و فن سے سیرابی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے بے شمار کتابیں تحریر کی ہیں۔ وہ ایک زود نویس قلم کار کے طور پر بھی مشہور و معروف ہیں، لیکن زود نویسی بھی کسی کسی کو نصیب ہوئی ہے، یہ انعام خداوندی ہے، وہ اپنے خاص خاص بندوں کو اس ہنر سے نوازتا ہے اور یہ بات اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ ہمیں مختصر سی تحریر بھی لکھنی ہو تو کئی کئی دن سوچتے گزر جاتے ہیں، پھر اگر طبع رواں ہوتی ہے، تو قلم اس کا ساتھ نہیں دے پاتا اور اگر قلم ساتھ چلنے کے لیے راضی ہوتا ہے، تو وقت اور ماحول اور فضا کی ناآسودگی آڑے آ جاتی ہے۔ لکھنے والے کے لیے یہ تینوں باتیں بہت اہم اور اشد ضروری ہیں کہ اس کی طبیعت بھی مائل ہو، قلم بھی اس کا ساتھ دے اور وقت بھی آسودہ خاطری کا ہو۔ بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ تینوں باتیں اکٹھی ہو کر کسی کے نصیب میں آئی ہوں، پھر جس کے حصہ میں یہ نعمتیں آئیں، اسے بجا طور پر خوش نصیب کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے دوستوں میں وزیر آغا کا نام سب سے نمایاں اور اہم ہیں۔ ڈاکٹر انور ...یر آغا سے زندگی کرنے کا ڈھنگ بھی سیکھا اور ادب میں زندہ رہنے کا سلیقہ بھی۔ ...گی میں ڈاکٹر انور سدید نے دو کتابیں "وزیر آغا ایک مطالعہ" اور "شام کا سورج" ...ی محبت، عقیدت اور ارادت کا والہانہ اظہار ہے۔ "یادنامہ" میں ان مضامین کو ...ہے، جو وزیر آغا کی وفات کے بعد مختلف اوقات میں ڈاکٹر انور سدید نے تحریر کیے۔ ...میں بھی وزیر آغا سے دلی وابستگی اور جذباتی کیفیات کا شدید اظہار موجود ہے۔ یقیناً ...یر آغا کی ادبی زندگی کو ایک اور ...

ISBN 978-969-452-024-5